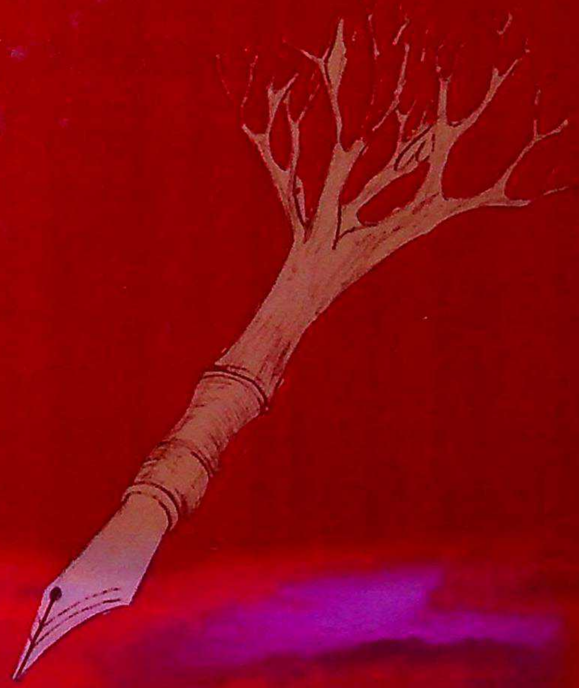
ارسطو کی واپسی

(افسانے، تجزیے، گفتگو، اوراق پارینہ اور تاثرات)



وحشی سعید

ترتیب و تدوین

نور شاہ - ڈاکٹر اشرف آثاری

MEEZAN PUBLISHERS & DISTRIBUTORS

ارسطو کی واپسی

افسانے ۔ تجزیئے ۔ گفتگو ۔ اوراق پارینہ ۔ تاثرات

وحشی سعید

ترتیب وتدوین

نورشاہ ، ڈاکٹر اشرف آثاری

وحشی سعید : مدیراعلیٰ ''نگینہ انٹرنیشنل'' ہوٹل شہنشاہ پیلس، بلیوارڈ، سرینگر ۔ 190001 (کشمیر)

فون : 9419012800؛ ای میل: nagina986@gmail.com

نام کتاب: ارسطو کی واپسی

مصنف: وحشی سعید

ترتیب وتدوین: نورشاہ ، ڈاکٹر اشرف آثاری

سرورق: ظہور ترنبو

صفحات: دوسوآٹھ

قیمت: تین سو پچاس روپے

ٹائپ سیٹنگ: محمد فاروق (9419968112)

ناشر: میزان پبلشرز

تعدا: 500

سن اشاعت: 2017ء

زیر اہتمام: شبیر احمد ماٹجی

تقسیم کار۔

۱) میزان پبلشرز، بالمقابل فائر سروسز ہیڈکوارٹر، بٹہ مالو سرینگر، کشمیر 9419002212

۲) ''نگینہ انٹرنیشنل''، ہوٹل شہنشاہ پیلس، بلیوارڈ، سرینگر، کشمیر

انتساب

اراکین مجلس ادارت
"نگینہ انٹرنیشنل"

ظہور احمد ترنبو ، عبدالمجید ترنبو

نور شاہ

مظفر ایرج اور ڈاکٹر اشرف آثاری

کے نام

وحشی سعید

ترتیب

اپنی بات

افسانہ زمانہ قدیم سے مختلف زبانوں میں اپنے اسلوب، اپنے انداز اور مختلف شکل وصورت میں لکھا جارہا ہے اور اُس وقت تک لکھا جائے گا جب تک ہمارے تخلیقی عمل میں سماجی، معاشی، تہذیبی، سیاسی اور تاریخی شعور کی وابستگی قائم رہے گی۔ میں سمجھتا ہوں کہ تجربوں کے اظہار کے لئے افسانہ ایک موثر وسیلہ ہے، مشاہدہ ہے، احساس اور بصیرت ہے۔ موجودہ دور میں انسانی ترجیحات اور سماجی قدریں بدلتی رہتی ہیں۔ پرانے تقاضے بدلتے رہتے ہیں۔ ضروریات میں ان دیکھی، انجانی تبدیلیاں آتی رہتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ افسانوی اسلوب میں بھی نیا نظریہ اپنی جگہ بنا رہا ہے۔ میں گزشتہ چالیس برسوں سے ریاست جموں وکشمیر کے افسانوی ادب سے وابستہ ہوں۔ جب میں نے افسانہ لکھنا شروع کیا تھا تو شاید وہ افسانے لکھنے کی عمر نہ تھی۔ لیکن گھر اور گھر سے باہر اسکول سے یونیورسٹی تک مجھے جو ماحول ملا اور جس ماحول میں ذہنی پرورش پائی اُس ماحول میں بھی اگر میں افسانہ نہ لکھ لیتا تو وہ شاید میری بدنصیبی ہوتی۔ میں کچھ عرصہ افسانوی ادب سے دور رہا۔ اپنی دوسری مصروفیات کی وجہ سے افسانوں کی دنیا سے دور چلا گیا، لیکن اس دوران بھی افسانہ میرے ذہن میں پنپتا رہا، میرے قلم کو قوت بخشتا رہا اور جب میں لوٹ کر آیا تو مجھے یہ جان کر بے حد مسرت ہوئی کہ نہ صرف ماضی میں میرے پڑھنے والوں نے میرا استقبال کیا بلکہ نئی نسل بھی میرے نام سے ناواقف نہ تھی۔ میں سمجھتا ہوں کہ ایک کہانی نگار کے لئے یہ سب سے اہم اور بڑا انعام ہے

''ارسطو کی واپسی'' پیش خدمت ہے۔ اس تعلق سے یہ کہنا چاہوں گا کہ اس میں آپ کو چالیس سال قبل کا وحشی سعید اور آج کا وحشی سعید دونوں نظر آئیں گے۔

میری اس نئی تصنیف کی ترتیب وتہذیب کے لئے میں نور شاہ اور ڈاکٹر اشرف آثاری کا شکریہ ادا کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔

وحشی سعید

سرینگر: اکتوبر 2017ء

پروفیسر قدوس جاوید

وحشی سعید ۔۔ افسانے کی نئی سڑک

وحشی سعید کی افسانہ نگاری کے بارے میں بھی میری یا کسی اور کی رائے نہ تو حتمی ہوگی اور نہ قطعی۔ اس لئے کہ افسانہ میں افسانہ نگار محض افسانہ نہیں بیان کرتا بلکہ اپنے ماحول، معاشرہ اور ثقافت کے اندر نمو پذیر ہونے والے کسی بھی نوعیت کے رشتہ، جذبہ، احساس، تجزیہ یا مشاہدہ اور معاملات (ڈسکورس) کی فنی و جمالیاتی صورت گری کرتا ہے۔ لفظ لفظ صورت گری کے اس عمل سے جو قلم کار مردانہ وار گزر جانے کا ہنر اور حوصلہ رکھتا ہے وہی اپنی تحریر کو ''افسانہ'' بنانے میں کامیاب ہوتا ہے اور وحشی سعید میں یہ ہنر، یہ حوصلہ ہے۔ یہ میں نہیں ان کے افسانوں کی زندہ، متحرک اور خود نگر زبان بولتی ہے جو ان کے بیانیہ کی شہ رگ ہے۔ وحشی سعید نے افسانہ نگاری کا شوق کم و بیش پینتیس چالیس سال قبل پالا تھا، لیکن وہ افسانوں کے ساتھ ساتھ ناول اور ناولٹ بھی لکھتے رہے اور آج کی تاریخ میں فکشن نگاری ان کی فطرت کا لازمہ بن چکی ہے۔ اپنے افسانوی مجموعہ ''سڑک جا رہی ہے'' میں شامل افسانہ ''نیلام'' کے راوی کی زبانی وحشی سعید خود کہتے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔

''میں وقت کے چرخے میں خون جگر کی داستان لکھتا رہا۔ کبھی اس داستان میں فاروق بھی شامل تھا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ مجھے کہانیاں لکھنے کا شوق ہی نہ تھا۔ نئے نئے کردار، نئے نئے انداز سے پیش کرنے کا جذبہ نہ تھا۔ فاروق (نازکی) کی شاعری نے مجھے کہانیاں لکھنے پر اُکسایا۔ پھر زندگی کے اچھے برے کردار آتے رہے'' (افسانہ: نیلام؛ ص:95)

غالباً تیس پینتیس سال قبل وحشی سعید کا ایک مختصر افسانوی مجموعہ شائع ہوا تھا اور میں نے کشمیر یونیورسٹی کے مجلّہ ''بازیافت'' میں اس پر تبصرہ بھی لکھا تھا، لیکن پھر وحشی سعید کی تخلیقیت کی جھیل ڈل اُلٹی سمت میں بہتی ہوئی کہیں اور نکل گئی، لیکن ادھر اُدھر افسانہ کی شکل میں وحشی سعید کی ''تخلیقیت'' کی لہریں سر اُٹھاتی بھی رہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کشمیر کی ادبی محفلوں میں جب بھی وادی کے افسانہ نگاروں کا ذکر چھڑتا تو نور شاہ، علی محمد لون، حامدی کاشمیری، پریم ناتھ پردیسی، پریم ناتھ در، پشکر ناتھ، کلدیپ رعنا، عمر مجید، وجیہہ اندرابی اور مخمور بدخشی وغیرہ کے ساتھ ساتھ وحشی سعید کا نام بھی لازمی طور پر لیا جاتا تھا۔ اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ وحشی کے مذکورہ افسانوں میں کچھ نہ کچھ ایسا ضرور تھا جو انہیں ادبی محفلوں میں زندہ رکھے ہوئے تھا۔ لیکن جیسا کہ ذکر ہوا خود افسانہ نگار وحشی سعید کہیں پس منظر میں گم ہو گیا تھا۔ اکیسویں صدی کی پہلی دہائی تک آخرش انکشاف ہوا کہ وحشی سعید کے تخلیقی سوتے خشک نہیں ہوئے تھے بلکہ اپنے بہاؤ کے نئے راستوں کا انتظار کر رہے تھے۔ آج تک وحشی سعید کے کئی افسانوی مجموعے، ناول اور ناولٹ تھوڑے وقفے سے سامنے آتے رہے ہیں، مثلاً غم کی رات، منزل اور تلاش، اُلٹا انسان، خون اور محبت، اور قحط وغیرہ۔ ظاہر ہے کہ یہ افسانے، ناول اور ناولٹ الگ الگ وقتوں میں لکھے گئے۔ ان کے موضوعات، اسالیب اور تخلیقی واظہاری رویوں سے ایسا ہی لگتا ہے۔ وحشی سعید کا اصل نام محمد سعید ترنبو ہے۔ وحشی سعید ان کا قلمی نام ہے۔ ان کی پیدائش ایک خوش حال گھرانے میں ہوئی۔ موصوف شہر سرینگر کے مشہور سیاحتی مرکز بلیوارڈ میں واقع ایک شاندار فائیو اسٹار ہوٹل ''شہنشاہ'' کے مالک ہیں اور یہ ہوٹل کشمیر میں ادبی سرگرمیوں کا اہم ترین مرکز بھی ہے، جہاں آئے دن تقریبات منعقد ہوتی رہتی ہیں۔ وحشی سعید صاحب کی سرپرستی میں ایک معیاری ادبی رسالہ ''نگینہ'' بھی پابندی سے شائع ہو رہا ہے۔

وحشی سعید کا ایک اہم افسانوی مجموعہ ''سڑک جارہی ہے'' کے نام سے جون 2014ء میں شائع ہوا۔ جس ماحول، معاشرہ اور ثقافت میں وحشی سعید کی تخلیقیت پروان چڑھی ہے وہ دہلی اور ممبئی یا لاہور اور کراچی جیسے ادبی مراکز کے ماحول، معاشرہ اور ثقافت سے بڑی حد تک

مختلف ہے۔ حالانکہ وحشی سعید کے افسانوی مجموعہ ''سڑک جارہی ہے'' میں اکثر افسانوں کا میدان عمل یا جائے وقوع ممبئی، دہلی اور حیدرآباد جیسے ترقی یافتہ شہر بھی ہیں جہاں کا سیلیکون، سماج اور ثقافت ریاست جموں وکشمیر کے سماج اور ثقافت سے مختلف ہے۔اس ضمن میں ہڑتال، جب ممبئی جھک جائے گی، اُلجھے لمحے، یاد، دل والی، احساس کا گھاؤ، وغیرہ افسانے اہم ہیں۔ ممبئی دلی وغیرہ کے سماجی اور ثقافتی کھوکھلے پن کی تصویر کشی اس انداز میں کی ہے گویا وحشی سعید کی زندگی انہیں خرابوں میں گزری ہو ۔ ۔

''جب ممبئی جھک جائے گی تو تاج محل ہوٹل کی شاندار عمارت کہاں ہوگی ۔ ۔ اس میں ٹھہرنے والے لوگ کہاں ہوں گے۔ممبئی کی دھرتی میں ان کے ایسے راز پوشیدہ ہیں جن کے افشاں ہوتے ہی ان کو چلو بھر پانی میں ڈوب مرنا ہوگا''

(جب ممبئی جھک جائے گی؛ ص : 49)

''ممبئی رنگین تھی۔اس رنگین دنیا میں طاہر کی توجہ کا مرکز بہت سی لڑکیاں تھیں لیکن جودھ پور کی حسینہ اس کے دل پر قابو پا گئی'' (افسانہ : اُلجھے لمحے؛ ص : 55)

''فلم اسٹوڈیو کے پاس جو چھوٹا اور واحد ریسٹورنٹ تھا وہ احمد خان کا تھا۔احمد خان اس کا سب کچھ تھا۔بیرے سے لے کر مالک تک کے سب فرائض وہ انجام دیتا تھا''

(افسانہ: یاد؛ ص: 81)

''اپنی نگوڑی قسمت ہی ایسی ہے۔پان دان سے پان اُٹھاتے ہوئے چھوٹی بیگم نے بوڑھی نوکرانی سکینہ سے کہا۔سکینہ نے پان دان کا ڈھکن بند کرتے ہوئے کہا:ایو بیگم صاحبہ،آپ کو اس کا علاج کرنا چاہیے'' (افسانہ: وارث کی تلاش؛ص:99)

اپنی ذاتی زندگی میں وحشی سعید ایک شریف النفس اور وضع دار انسان ہیں۔ انسانی قدروں کا احترام ان کی شخصیت اور فن کو تقدس بخشتا ہے۔

''انسانی ضمیر، ایمان داری، انسانی اقدار وغیرہ صفات کے زوال نے ایک طرف تو انسان کو حیوان بنا دیا ہے۔ دوسری جانب اس زوال آدم کے سبب معاشرے کے ہر شعبے میں خود غرضی، مفاد پرستی، بدعنوانی اور فرقہ واریت کی اثر پذیری ایک چیلنج ثابت ہو رہی ہے۔ انسانی تشخص کے اس بحران کے خلاف پوری دنیا کے ادیب و دانش ور صف آراء ہیں۔ اردو کے کئی دوسرے ادیبوں اور دانشوروں کی طرح وحشی سعید کے افسانوں میں بھی اس صورت حال کے خلاف تشویش و احتجاج ملتا ہے لیکن بڑے ہی فن کارانہ انداز میں۔ وحشی سعید کو اس بات کا احساس ہے کہ معاشرے میں پھیلی ہوئی بدعنوانی، بے ایمانی اور ضمیر فروشی کے رجحانات اگر عام ہیں تو اس کی جڑیں ہمارے اخلاقیات سے عاری سماجی اور معاشی نظام میں پیوست ہیں۔ ایمان داری کی راہ پر چلنے والوں کو حالات ''گناہوں کا پجاری'' کے مرکزی کردار رشید کی طرح آخر کار ایمان فروشی کی راہ پر چلنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ بے ایمانی کی دنیا کے بادشاہ دھنی رام کے پاس آ کر باضمیر انسان رشید آ کر کہتا ہے: ہاں، آ گیا ہوں ۔ ۔ اپنے ایمان کے پیرہن کو ہلاک کر کے آ گیا۔ ضمیر کی زبان کاٹ کر رکھ دی۔ اصولوں کو بے حس کر دیا اور احساسات کو قتل کر دیا اور اب میں بے ایمانی کے راستے پر چلنے کے لئے آمادہ ہوں'' (افسانہ: گناہوں کا پجاری؛ ص: 91)

وحشی سعید کے افسانوی مجموعہ ''سڑک جا رہی ہے'' میں شامل ایک افسانے کا عنوان ''بھنگی'' ہے۔ عنوان پر نظر پڑتے ہی کرشن چندر کے ''کالو بھنگی'' کی یاد آنا ایک فطری امر ہے اور سوچا جا سکتا ہے کہ جس طرح سریندر پرکاش نے پریم چند کے ''ہوری'' اور شوکت حیات نے گھیسو

اور مادھو کو لے کر افسانہ میں متن پر متن قائم کرنے کی مثالیں پیش کی ہیں، اسی طرح وحشی سعید نے بھی کرشن چندر کے کالو بھنگی کے کردار کو لے کر متن پر متن قائم کیا ہے لیکن یہ سچ نہیں۔ درست ہے کہ وحشی سعید نے سماج کے انتہائی نچلے اور ناپسندیدہ طبقے کے ایک فرد کو اپنے افسانے کا موضوع بنایا ہے لیکن کرشن چندر کے کالو بھنگی اور وحشی سعید کے صمد بھنگی میں فرق ہے۔ کالو بھنگی کرشن چندر کا گھڑا ہوا افسانوی کردار ہے لیکن صمد بھنگی سماج کا ایک جیتا جاگتا انسان ہے۔ کالو بھنگی کرشن چندر کا ذاتی غلام ہے جو بھنگی پیدا ہوا، اور بھنگی ہی رہنا چاہتا ہے۔ اس کی صرف ایک ہی خواہش ہے کہ افسانہ نگار کرشن چندر بھی اس کی بھی کوئی کہانی لکھ دے۔ کرشن چندر کو کالو بھنگی سے ہمدردی ہے لیکن کرشن چندر، کالو بھنگی اور عام بھنگیوں کے قابل رحم سماجی حالات بدلنے کے بارے میں اپنی کوئی تعمیری رائے دیتے نظر نہیں آتے۔ اس کے برعکس وحشی سعید سماج کے اس طبقاتی نظام پر ہی چوٹ کرتے ہیں جس نے بھنگیوں کو ہتک آمیز زندگی جینے پر مجبور کر دیا ہے۔ وحشی سعید ''بھنگی'' جیسے ان تمام الفاظ کو ہی لغت سے خارج کر دینے پر اصرار کرتے ہیں جن پر ہمارے سماج نے گندے گھناؤنے معانی کے لحاف چڑھا دئے ہیں ۔ ۔ ۔

''بھنگی کا لفظ جب زبان پر آتا ہے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ ہونٹوں تک ایک گالی چلی آئی ہے۔ اگر میں نے اردو زبان کی لغات کو مرتب کیا ہوتا تو اس لفظ کو کبھی شامل نہ کرتا۔ لفظ کبھی برے نہیں ہوتے، دراصل یہ انسانی ذہن ہے جو لفظوں کو برا بناتا ہے اور ان کو ایک ایسے ماحول کے سپرد کر دیتا ہے جہاں لفظوں کی اصلیت پر گندا لحاف چڑھ جاتا ہے۔ جب بھی میں لال چوک کی سڑک سے ٹانگے پر سوار گھر کی طرف جاتا تو کسی نہ کسی بھنگی کو سڑک صاف کرتے ہوئے دیکھتا۔ ایسے لمحات پر اکثر آدمیوں کے منہ لٹک جاتے۔ تب میرا دل چیخنے لگتا اور میں خود سے کہتا: اُٹھو اور لفظوں کا گندا لحاف اُتار کر پھینک دو'' (افسانہ : بھنگی ؛ ص : 72)

کئی اعتبار سے وحشی سعید کا افسانہ ''بھنگی'' کرشن چندر کے ''کالی بھنگی'' سے کہیں زیادہ بہتر افسانہ ہے۔ کالو بھنگی راضی برضا کردار ہے، جو نہ کچھ سوچتا ہے نہ چاہتا ہے۔ اگر اس کی کوئی چاہت ہے تو بس یہ کہ افسانہ نگار (کرشن چندر) کبھی اس کی بھی کہانی لکھ دے۔ اس کے برعکس وحشی سعید کا صمد بھنگی حوصلہ مند اور دوراندیش شخص ہے۔ صمد بھنگی بڑے یقین کے ساتھ کہتا ہے ۔ ۔

''نہیں بابو، وہ بھنگی نہیں بنے گا۔ وہ آپ کی طرح بہت بڑا آدمی بنے گا۔ میں اس کو خوب پڑھاؤں گا''

وحشی سعید کے افسانہ بھنگی کا اختتامیہ بے حد دردناک اور متاثر کن ہے ۔ ۔ ۔

''پھر ۔ ۔ ایک دن ۔ ۔ صمد کا بیٹا لال چوک کی سڑک صاف کرتے ہوئے ایک موٹر کی زد میں آ گیا۔ معصوم بچے کا خون سڑک پر پھیل گیا۔ صمد بت کی طرح کھڑا رہا۔ وہ صرف اتنا کہہ سکا ۔ ۔ ۔ میں اس کو وہ نہ بنا سکا جو وہ بننا چاہتا تھا۔ اس لئے خدا نے اس کو واپس بلا لیا۔
دوسرے دن میں نے صمد کو سڑک پر اپنے ہی بیٹے کے خون کے دھبوں کو صاف کرتے ہوئے دیکھا ۔ ۔ کیونکہ ۔ ۔ وہ ۔ ۔ بھنگی تھا''

(افسانہ: بھنگی ؛ ص : 74)

چونکہ وحشی سعید کے افسانے اکیسویں صدی کی پہلی دوسری دہائی میں سامنے آئے ہیں لیکن ساخت، موضوعات اور بنت کے اعتبار سے ان کے (سڑک جارہی ہے) کے افسانے کئی جہتوں سے بیسویں صدی کے (احمد ندیم قاسمی، اقبال مجید، رام لعل، جوگندر پال اور نور شاہ وغیرہ) نمائندہ افسانہ نگاروں کے افسانوں سے جدلیاتی رشتہ رکھتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں فنی، فکری

اور اسلوبیاتی اعتبار سے وحشی سعید کے افسانوں کی سڑک کشمیر سے شروع ہوکر برصغیر ہندو پاک کے مختلف شہروں اور گلی کوچوں تک پہنچتی ہے۔ وحشی سعید کا افسانہ ''سڑک جا رہی ہے'' اس مجموعے کا آخری افسانہ ہے۔ انہوں نے اسی کو اپنی کتاب کا سرنامہ بھی بنایا ہے۔ یہ عنوان استعاراتی ضرور ہے لیکن مذکورہ افسانہ استعاراتی نہیں بن پایا ہے حالانکہ اس افسانے کے پہلے پیراگراف میں وحشی سعید نے تمثیلی فضا قائم کی ہے ۔ ۔

> ''موسیٰ محلے میں پہلی بار پختہ تارکول کی سڑک جا رہی ہے۔ بل کھاتی ہوئی اس سڑک کے کنارے ایک مکان کھڑا ہے، ایک ایسا مکان جو خود بھی ایک تمثیل بن کے رہ گیا ہے۔ اب تو اس مکان نے اپنے ساتھ ایک مخصوص نام بھی لپیٹ لیا ہے''
>
> (خونی بنگلہ)

افسانہ کے اس ابتدائی ساختے میں سریت، تجسس اور ڈرامائیت کے عناصر ہیں۔ ''خونی بنگلہ'' کے اندر سے علامتی اور استعاراتی اسلوب میں تمثیلی اور داستانی افسانہ بنا جا سکتا ہے۔ اس افسانہ میں اس کے لئے خام مواد موجود بھی ہے مثلاً پراسرار عمارت، مغل دور، انگریزوں کا اقتدار، جاگیردارانہ نظام، دوسری جنگ عظیم، بے جوڑ شادی، جنسی ناآسودگی، طوائف اور فرسودہ اخلاقیات وغیرہ۔ لیکن ان سب کے باوجود دو قدم آگے چل کر کہانی نہ تو تمثیلی رہ جاتی ہے نہ داستانی۔ پھر بھی افسانہ کے اخیر کا ایک جملہ کہانی میں افسانویت پیدا کر دیتا ہے۔ کہانی کا بوڑھا کردار ہری لال اپنی جوان بیوی نینا کی بے وفائی سے بددل ہوکر بھکاری بن جاتا ہے اور نینا اپنے ہی سوتیلے بیٹے کے ساتھ میاں بیوی کی طرح رہنے لگتی ہے اور ایک دن جب اچانک بھکاری ہری لال کے سامنے برج اور نینا میاں بیوی کی طرح آتے ہیں تو حیرت اور صدمے سے ہری لال پر سکتہ طاری ہو جاتا ہے ۔ ۔

''مگر جب بھکاری کی نگاہوں نے ان کو دیکھا ''تم''۔۔ مگر وہ آواز اُبھر نہ سکی بوڑھے کی زندگی صلیب پر چڑھ گئی''

اس افسانہ ''سڑک جارہی ہے'' کی معنویت کی تہوں کو کھولنے کے لئے اسے تمثیلی یا داستانی طور پر نہیں بلکہ Irony کے طور پر پڑھنے کی ضرورت ہے۔ اخلاقی نظام سے محروم ہوتی نئی تہذیب کی ''نئی سڑک'' انسان اور انسانیت کو زوال کی کن حدوں تک لے جائے گی کچھ کہا نہیں جاسکتا، لیکن یہ ''سڑک جارہی ہے'' وحشی سعید اس کا احساس دلانا چاہتے ہیں۔ افسانوی مجموعہ ''سڑک جارہی ہے'' میں شامل افسانوں کے حوالے سے وحشی سعید کی افسانہ نگاری کے اور بھی کئی امتیازات کی نشاندہی کی جاسکتی ہے لیکن یہاں صرف ایک اور اضافی رائے کا اظہار کر کے گفتگو کو سمیٹنا بہتر ہوگا۔ فکشن کے مشہور نقاد تودوروف کے مطابق افسانہ یا ناول میں تین جہات کا ہونا لازمی ہے۔۔

۱۔ معنیاتی جہت "Semantic" یعنی مواد کی جہت۔

۲۔ نحویاتی جہت "Syntactical" یعنی کہانی کے مختلف اجزاء میں ترتیب کی جہت۔

۳۔ لفظیاتی جہت "Verbal" یعنی لفظوں اور ترکیبوں کے خصوصی استعمال کی جہت۔

وحشی سعید کے افسانوں میں یہ تینوں جہات یکجا ہو کر اُن کے افسانوں کو فنی اور جمالیاتی، لسانی اور موضوعاتی ہر اعتبار سے اہم بناتے ہیں۔



نور شاہ

وحشی سعید ۔ ۔ فن اور شخصیت کے تناظر میں

ریاست جموں وکشمیر سے تعلق رکھنے والے جن افسانہ نگاروں نے اپنی افسانوی صلاحیتوں کی بدولت برصغیر میں اپنا ایک مقام بنایا، ایک منفرد پہچان بنائی اور اپنے قلم اور تحریروں سے اپنی اہمیت کا احساس دلایا، اُن میں وحشی سعید کا نام اہمیت کا حامل ہے۔ اُن کی مقبولیت کا راز اس بات میں پوشیدہ ہے کہ اُن کے افسانوں کے موضوعات وسیع تر ہوتے ہیں اور وہ نہ صرف ریاستی اور ملکی بلکہ عالمی سطح کے نئے پرانے سماجی، تاریخی، سیاسی، ثقافتی اور دوسرے اہم موضوعات کو علامتی انداز میں قلم بند کرتے ہیں۔ اُن کے افسانوں میں مختلف رنگ ونسل، مختلف نوعیت اور مختلف پس منظر کے کردار ملتے ہیں۔ ملکی اور غیر ملکی تواریخ کے اوراق کتنے بکھرتے اور نکھرتے نظر آتے ہیں۔ ماضی کے اَن گنت مناظر آنکھوں میں گھوم پھر جاتے ہیں۔ ایک باشعور افسانہ نگار کی طرح وہ حالات وواقعات کی صحیح اور سچی عکاسی اپنے مخصوص لب ولہجہ اور پُر اثر انداز تحریر میں کرتے ہیں۔ بڑی بات تو یہ ہے کہ اُن کے علامتی افسانوں میں کہانی پن کا طلسم قائم رہتا ہے۔ اُن کی ایک اور خوبی سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا۔ وہ اپنے تعلقات بڑھانے اور دوست بنانے کے فن سے بخوبی آشنا ہیں اور شاید یہی وجہ ہے کہ اُن کے دوست واحباب اور چاہنے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہے اور یہ تعداد بڑھتی ہی جا رہی ہے۔ سعید صاحب سادگی، نفاست، شرافت اور شائستگی کے پیکر ہیں۔ وہ ایک بے دار ذہن اور شائستہ سوچوں کے مالک ہیں۔ اُن کے لہجے میں

مٹھاس ہے۔اُن کے بارے میں یہ بات بغیر کسی تمہید کے کہی جا سکتی ہے کہ وہ ایک کامیاب بزنس مین بھی ہیں اور اپنے بزنس کی وجہ سے ہر سال کچھ عرصہ کے لئے اُنہیں اپنے ملک سے باہر جانے کے مواقع میسر ہو جاتے ہیں اور اس پس منظر میں عالمی سطح کے موضوعات اور نت نئے کردار اُن کے افسانوں کا حصہ بنتے ہیں۔ سیاست ہو یا سیکس، بزنس ہو یا ادب، وحشی صاحب دوسروں کی بات محبت اور شفقت کے ساتھ سنتے ہیں اور پھر دھیمے دھیمے سے لہجے میں اپنی بات بھرپور اعتماد کے ساتھ سامنے رکھتے ہیں اور اس طرح اپنی بات منوانے میں اُنہیں کوئی دشواری نہیں ہوتی۔ میرے خیال میں وحشی سعید کی زندگی کا یہ ایک خوبصورت پہلو ہے۔ جی ہاں وہ ایک محبت کرنے والے دوست اور شفیق ساتھی بھی ہیں اور اپنے دوستوں اور ساتھیوں کے دُکھ سکھ میں شامل ہو کر انہیں خوشی اور مسرت ملتی ہے۔

وحشی سعید ''نگینہ انٹرنیشنل'' کے مدیر اعلیٰ بھی ہیں۔ ادبی دنیا اور خاص طور سے اردو بستیوں اور اُردو زبان وادب سے لگاؤ رکھنے والوں کے لئے نگینہ اب محتاج تعارف نہیں۔ ''نگینہ'' ادبی میدان میں اپنے پاؤں مظبوطی کے ساتھ جما چکا ہے۔ وحشی سعید کا اردو زبان وادب کے ساتھ وابستگی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ''نگینہ انٹرنیشنل'' کی اشاعت کے تعلق سے وہ سارے اخراجات تن تنہا برداشت کرتے ہیں۔ وحشی سعید جموں کشمیر فکشن رائٹرز گلڈ کے تاحیات سرپرست اعلیٰ بھی ہیں۔ ریاست بھر میں لکھے جانے والے افسانوں کو ایک نئی منزل سے ہم کنار کرنے کے لئے ایک نیا انداز اور ایک نئی جہت دینے کے تعلق سے گلڈ وحشی سعید کی سربراہی میں ایک نہایت ہی اہم کارنامہ انجام دے رہا ہے۔ ادبی محفلوں اور مجلسوں کا اہتمام کرنے میں بھی وحشی سعید صف اوّل میں نظر آتے ہیں۔

موجودہ دور میں ریاست جموں وکشمیر کے تعلق سے وحشی سعید اردو زبان وادب کی ترقی، ترویج، اشاعت اور تشہیر کے لئے ایک قابل قدر کردار نبھا رہے ہیں۔

علیم صبانویدی

سانیٹ

(وحشی سعید کے افسانے ''آسمان میری مٹھی میں'' سے متاثر ہوکر)

ان کے افسانے کا پہلو فکر آور دل نشیں
ان کا احساس سفر ہے آفریں صد آفریں
ایک نو رنگ واقعات زندگی روشن ہوئی
اَن سنی ، انجانی مبہم آگہی روشن ہوئی
اپنے ہی ماحول کا عکاس ہے ان کا قلم
آرزو کا پھولتا پھلتا چمن ہے دیدہ نم
سبز چہرے درد کی پانیوں میں سنوارے ہوئے
ناگہانی بارشوں میں خود کو نہلائے ہوئے
ہر طرف ہیں زندگی کے خال و خد پامال سے
چاہتیں بسمل تمنائیں دریدہ پیراہن
خوبصورت چاند کو جیسے لگا ہے اب گہن
ہے نڈھال اب زندگی سیلاب کے بھونچال سے
ہے نمایاں ان کی تحریروں میں شہر کشمیر
نام ان کا ہے صبا ، وحشی سعید باضمیر

علیم صبا نویدی

نورانی عطا

(ایک سانیٹ وحشی سعید کے نام)

نقشہ بدل کے رکھ دیا وحشی سعید نے
اوراقِ گلستاں میں مہک ہے سعید کی
افسانوی ادب میں چمک ہے سعید کی
کتنا عجب سفر کیا وحشی سعید نے
اپنی الگ الگ راہ بنائی سعید نے
الفاظ کو دیا ہے نیا پیراہن کہیں
سوچوں کو دی ہے ایک نئی انجمن کہیں
کشمیر کی بہار دکھائی سعید نے
خامہ ہیں ان کے گوہر اظہار کی دھنک
تحریر ان کی حاصل کشمیر کی بہار
اوراق ان کی سوچ پہ کرتے ہیں جاں نثار
ہے ان کی انگلیوں میں نئے دور کی مہک
وحشی سعید وقت کی نورانی دین ہیں
تاریخ فکر و جذبہ کی رحمانی دین ہیں

مظفر ایرج

نام وحشی ہے

وقت کو راہِ محبت کی دکھائی جس نے
حق و انصاف کی ہر بات بتائی جس نے

میرؔ و مومنؔ و اقبالؔ سے رشتہ جوڑا
یاد غالبؔ کی نئی جوت جلائی جس نے

نام وحشی ہے پر وحشت کا کہیں نام نہیں
دل میں کینہ یا عداوت کا کہیں نام نہیں

ساقی و ساغر و مینا سے نہ رغبت کوئی
ناپسندیدہ کوئی لت ہے نہ عادت کوئی

ہر کسی شخص کو سینے سے لگا لیتے ہیں
کہ کدورت نہ عداوت نہ شکایت کوئی

یہی سعید نے سعادت کا ہے پیغام دیا
اہل اردو کو محبت کا ہے پیغام دیا

روز ہوتا ہے کسی محفل و مجلس کا نظام
تو نے ہر دور میں اردو کو دیا ارفع مقام

حسرت و یاس و سقاوت کی بھری دنیا میں
لے کے آئے ہو محبت کا رفاقت کا پیام

نہیں وحشی تیرا ثانی ہے زمانے بھر میں
نیکی و جود و سخاوت ہے تمہارے گھر میں

حسن اخلاق سے ہر دل پہ حکومت تیری
معاملہ فہمی ، فصاحت میں مہارت تیری

وہ ''نگینہ'' ہو یا اردو کے رسائل یا کتب
ہے اشاعت میں جو بے لوث حمایت تیری

اہل اردو کے لئے ایک سہارا ہے تو
تو محبت کا سمندر ہے کنارا ہے تو

منفرد ہے تیرا لہجہ ، تیرا اسلوب و بیاں
ذہن و دل پر تیری چھائی ہوئی ہے اردو زباں

وہ کہانی ہو یا ڈرامہ ہو یا تقریر تیری
اپنا تاثیر دکھاتا ہے تیرا زور بیاں

'باز گوئی' کو علامت سے اگر جوڑ دیا
فن افسانہ کو اس طرح نیا موڑ دیا

محفلیں سجتی ہیں یاں شعر و ادب کی ہر روز
قہقہے ، بزلہ سنجی اور یہ ساز اور سوز

گفتگو چھڑتی ہے تو لوگ جمے رہتے ہیں
بیٹھے رہتے ہیں کہ آئے نہیں وحشی جی ہنوز

ہر کسی شخص کو یہ ادبی فضا راس آئے
اور تکلم سے تیرے پیار کی بو باس آئے

قدرداں سب کے ہیں یہ سب کی پزیرائی کریں
حوصلہ دیتے ہیں یہ حوصلہ افزائی کریں

یہ کہ جتنے ہیں ملنسار کہاں ہے کوئی
راہ چلتے ہوئے لوگوں کی پذیرائی کریں

مل رہی ہے انہیں شہرت بھی اور عزت ہے بہت
ان کے گفتار میں لہجے میں حلاوت ہے بہت

یہ اسی طرح رہیں سایہ فگن اردو پر
مرکز علم و ادب ان کا ہے گھر اور دفتر

فن افسانہ کی تخلیق میں ہو ان کا نام
ان کے شہہ پاروں میں ہو اور اثر اور اثر

ہم ہی کیا اہل زباں ان کو دعا دیتے ہیں
یاد غالبؔ کی نئی جوت جلا دیتے ہیں



عالم بنارسی

نذرِ وحشی سعید

گوشہ گوشہ ہے حسن کی تصویر
اس کو کہتے ہیں وادیٔ کشمیر
اس کو کہتے ہیں آبروئے وطن
اس کو کہتے ہیں جنت ارضی
کوچہ کوچہ ہے میزباں اس کا
ذرہ ذرہ ہے اس کا مہماں نواز
جابجا اس میں ہیں چنار کے پیڑ
دیو قامت ہیں دیودار کے پیڑ
ایک اک گل پہ ہے انوکھا نکھار
کیا نرالا ہے اس کا لالہ زار
اس کے صحرا میں بھی بسے ہے بہار
زعفرانی ہیں زعفران کے کھیت
باغ اوڑھے ہیں سیب کی چادر
برف اوڑھے ہوئے کھڑے ہیں پہاڑ
نغمگی سی ہے آبشاروں میں
کچھ الگ بات ہے نظاروں میں

کیا سہانا ہے جھیل کا منظر

جس کی آغوش میں شکارے ہیں

جو پسارے ہیں اپنی بانہوں کو

لگ رہا ہے بلا رہے ہیں ہمیں

ساحلوں کی بھی دلکشی ہے عجب

کیا نظارہ ہے حسن قدرت کا

جھیل ڈل کے کنارِ قلب کے پاس

خوبصورت جو ایک پیلس ہے

سب شہنشاہ جس کو کہتے ہیں

اُس میں رہتا ہے اِک فسانہ نگار

جس کے سینے میں ہے سماج کا درد

اور سب کے لئے محبت ہے

اُس کا شیوہ ہی سب کی خدمت ہے

میں نے ڈھونڈا، بہت تلاش کیا

اس پہ وحشت کا کچھ گماں نہ ملا

لوگ پھر بھی بڑے ہی پیار کے ساتھ

اس کو وحشی سعید کہتے ہیں



ارسطو کی واپسی

جہاں سقراط کے سفر کا اختتام ہوا، وہیں سے ارسطو کا سفر شروع ہوا۔ سقراط نے نظام حکومت اور زندگی کے بہترین اوصاف سے یورپ کو واقف کرایا۔ اسی وراثت کی ارسطو نے پذیرائی کی۔ سقراط سچائی کا علمبردار تھا۔ ارسطو ایک ایسا مفکر تھا جس نے سیاست کو تنگ وتاریک گلیاروں سے نکال کر عالمی منظر پر ایک نئی پہچان دی۔

ارسطو یونان کے بادشاہ سکندر کا مشیر خاص تھا۔ سکندر کو سکندر بنانے میں ارسطو کا کلیدی رول تھا۔

رات کا نہ جانے کون سا لمحہ رہا ہوگا جب میں ارسطو کو تاریخ کے اوراق میں ڈھونڈ رہا تھا۔ میری یہ کھوج ایک ایسے دھماکے کی نذر ہوگئی جس نے ساری کائنات کا دل دہلا کے رکھ دیا۔ ہر طرف چیخوں اور آہ وبکا کا سماں برپا ہوگیا۔ یوں محسوس ہوا کہ شاید ہم زندگی کے اختتامی سفر پر روانہ ہوگئے۔ دھماکے کے بعد گولیوں کی برسات شروع ہوگئی۔ فوجیوں کے جوتوں کی ٹاپوں سے تارکول کی سڑکیں چیخوں سے ابل پڑیں۔

پھر اچانک آوازوں کا سمندر سیلاب بن کر اُبھرا ۔ ۔ ۔

"۔ ۔ کیا ہوا؟"

دھماکہ بھی خاموش ہوگیا۔ فوجیوں کے جوتوں کی ٹاپوں کی آوازیں بند ہوگئیں۔ لوگوں کی چیخیں سرگوشیوں میں بدل گئیں۔ وہ ایک دوسرے سے یہ معلوم کر رہے تھے کہ کس کو پکڑا گیا؟

فاتح عالم سکندر کی فوج جب ہندوستان کی سرحدوں پر کھڑی ہوئی، سکندر کی فاتح فوج کے سامنے وہ ہندوستان تھا جس کا ذکر تواریخ کی کتابوں میں کچھ یوں کیا گیا تھا کہ دنیا میں اگر کوئی ملک ''سونے کی چڑیا'' کہلاتا ہے، تو وہ ہندوستان ہے۔

بکتر بند گاڑی ایک عام شہری کے سامنے رُک گئی۔ فوجیوں نے اس کو گھیرے میں لے لیا۔ وہ شش و پنج میں پڑ گیا اور خود سے سوال کر رہا تھا۔۔۔

''یہ کیا ہو رہا ہے؟''

اس سے پہلے وہ اپنے اس سوال کا جواب ڈھونڈتا، فوجیوں نے اس عام شہری کو بکتر بند گاڑی کے سامنے باندھ دیا اور اس عام شہری کے گلے میں ایک تختی آویزاں کر دی۔۔
''دہشت گرد''

مفکر ارسطو نے سکندر کو اٹھارہ سال کی عمر میں جو پہلا سبق سکھایا تھا، وہ یوں تھا۔۔۔

> ''سکندر، تم اب فوج کے ایک مکمل کمانڈر بن گئے ہو اور اب تم قلیل مدت میں دنیا کو فتح کرنے والے، سب سے بڑے فاتح عالم بننے والے ہو۔ لیکن سکندر اعظم بننے کے لئے ننگے پاؤں تپتے ہوئے ریگستان سے گزرنا ہوگا۔ مقدونیہ کے بادشاہ، تم جب فاتح عالم ہو گے، تمہیں یہ یاد رکھنا ہوگا کہ انسانوں اور انسانی اقدار کو کبھی پامال نہ ہونے دو گے۔ اس بات کا خیال رکھنا کہ تمہارے دشمن کی پسپائی تمہارے انا کو غرور میں نہ ڈال دے''

ارسطو کا یہ سیاست کا سبق سکندر کے لئے کسی مقدس کتاب کے قول سے کم نہ تھا۔ اس کی فوج نے ہندوستان کو فتح کیا۔ راجہ پورس کو گرفتار کیا گیا اور زنجیروں میں جکڑے ہوئے پورس کو سکندر کے سامنے پیش کیا گیا۔ سکندر اپنے جاہ و جلال کے ساتھ تخت یاقوت پر بیٹھا ہوا تھا۔ دربار سجا

ہوا تھا۔ سکندر کے دربار میں درباریوں کے علاوہ فوج کے اعلیٰ کمانڈر بھی تھے۔ سکندر پورس سے اپنی گرج دار آواز میں مخاطب ہوا ۔ ۔ ۔

''بتا راجہ پورس تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا جائے؟''

راجہ پورس نے اپنی آواز میں ٹھہراؤ لا کر جواب دیا ۔ ۔ ۔

''جو ایک بادشاہ کو دوسرے بادشاہ کے ساتھ کرنا چاہیئے''

فوج کے کمانڈر اور درباری جو سکندر کے دربار کی رونق بنے ہوئے تھے، ایک دوسرے کے چہرے کے تاثرات پڑھنے لگے۔ ان سب کی متفقہ رائے تھی کہ اب سکندر پورس کا سر قلم کر دینے کا حکم دیں۔

لیکن سکندر، سکندر تھا۔ وہ گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ ان سوچوں کے بیچ میں سکندر کو محسوس ہوا کہ ارسطو اس کے سامنے کھڑا ہے ۔ ۔ ۔

> ''میرے سب سے بڑے اور عزیز شاگرد سکندر! تمہیں تاریخ نے ایک سنہرا موقع فراہم کیا ہے۔ اب تک تم صرف فاتح عالم تھے۔ اب تم سکندر اعظم بننے والے ہو۔ شرط یہ ہے کہ انسانی اقدار کو پامال نہیں ہونے دو گے''

سکندر اپنے تخت سے کھڑا ہو گیا اور بلند و بالا آواز میں بول پڑا ۔ ۔ ۔

> ''سپاہیو! راجہ پورس کو زنجیروں سے آزاد کر دو۔ مقدونیہ کا بادشاہ ہندوستان کے راجہ سے بغل گیر ہو گا''

وہ عام شہری جس کو فوجیوں نے بکتر بند گاڑی کے سامنے والے حصے پر باندھ لیا تھا، اسے سنسان شہر کی سنسان گلیوں اور سڑکوں پر گھما رہے تھے۔ وہ فوجی اپنی اس فتح پر ناچ

رہے تھے۔ بگل بجا بجا کر اپنی جیت کا اعلان کر رہے تھے۔

سکندر اعظم نے ہندوستان فتح کیا اور اس نے ہندوستان پورس کو واپس لوٹا دیا۔ سکندر اعظم نے جب اپنے وطن واپس لوٹنے کا سفر شروع کیا تو راجہ پورس نے تشکر بھری آنکھوں سے سکندر اعظم کو الوداع کیا۔ ارسطو کا شاگرد، مقدونیہ کا شہنشاہ سکندر اعظم انسانی تواریخ کا ایک ناقابل فراموش حصہ بن گیا۔

وہ صبح بھی کالی تھی۔ وہ شام بھی سیاہ تھی، جس نے ایک عام شہری کو انسانی سپر بنتے ہوئے دیکھا۔ جس فوجی نے انسانیت کو پامال کیا، اُس فوجی کو اس کے کمانڈر نے بہادری کے تمغے سے نوازا۔

سکندر اعظم اپنے وطن مقدونیہ پہنچنے سے پہلے ہی دار فانی کوچ کر گیا۔

ارسطو نے اپنے عظیم شاگرد سکندر اعظم کی موت پر آنسو نہیں بہائے کیونکہ سکندر اعظم انسانی تواریخ میں امر بن چکے تھے۔

کئی ہزار سال گزر گئے جب ارسطو کی واپسی ہوئی، لیکن اس ارسطو کی آنکھیں خون کے آنسو بہا رہی تھیں۔



تجزیہ نگار :
ڈاکٹر اشرف آثاری

ارسطو کی واپسی

تجزیہ

گزشتہ ایک دو دہائیوں کے دوران اردو میں جو افسانے تخلیق ہوئے ہیں اُن پر ایک تنقیدی نظر دوڑاتے ہوئے جہاں افسانے کی تخلیقیت کے تقاضوں اور ضرورتوں سے متعلق کئی سوالات ذہن میں اُبھرتے ہیں کہ جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے ادوار کے بعد تخلیق ہونے والے افسانوں کی اہمیت وافادیت، سمت و حدود، حسیت وحسایت، فن وقواعد، لفاظی واسلوب وبیان، راست گوئی یا بیانیہ ونتیجہ خیزی وغیرہ جیسے کئی موضوعات یا افسانوی جزیات پر باتیں ہونے لگیں اور ان پر سوچا جانے لگا ہے۔

ہر نئے دور میں نئے تخلیقی تقاضے سامنے آجاتے ہیں اور مروجہ ادبی اصناف سخن نئے اور بدلتے ہوئے حالات وواقعات کے زیر اثر رہتی ہیں اور ادب فہمی اور تخلیقیت کے نئے مغائیر بھی معرضِ وجود میں آتے رہتے ہیں۔ اس طرح کی بدلتی ہوئی صورتِ حال ہر دور میں ادیبوں اور نقادوں کے لئے بھی ایک چیلنج کی حیثیت رکھتی ہے، کیونکہ ان کی تخلیق کا دارومدار معاصر فہم وفراست، فکر وسوچ، عقل وشعور اور دیگر متعلقہ معاملات پر ہوتا ہے۔ ہر دور کے افسانہ نگاروں کو

عام قارئین ادب کی طرح ہی مطالبات زمانہ اور ہوشربا تغیرات وتبدیلیوں سے ہمکنار ہونا پڑتا ہے اور بحیثیت ایک فرد کے ہی انہیں جھیلنا بھی پڑتا ہے۔ اس لئے لامحالہ طور پر اس سب صورت حال کا اثر ان کے تخلیقی اور ادبی شعور پر بھی پڑتا ہے۔ ظاہر بات ہے اس سے تخلیق ہونے والے افسانوں کے تمام تر جزیات مثلاً ان کی صنف وتکنیک، تخلیق وشناخت، ہیئتی نظام، فنی وفکری اظہاریت وترسیل، لسانی نظام، متن وغیرہ متاثر ہوتے ہیں۔

اس طرح کے مسائل ومعاملات اردو کے ماقبل کے افسانہ نگاروں اور نقادوں کے اذہان میں بھی کھلبلی پیدا کرتے تھے۔ غالباً اسی لئے انہوں نے بھی ان کے زیر اثر حقیقت نگاری سے علامت نگاری کی طرف مراجعت کی تھی کہ کرشن چندر جیسے افسانہ نگار نے بھی ''غالیچہ'' جیسا علامتی افسانہ تخلیق کیا تھا۔

آج کا انسان آنکھوں کو چکاچوند کرنے والے سائنسی ایجادات، نئی ٹیکنالوجی اور حیرت انگیز تبدیلیوں سے دوچار ہے جن سے اس کے نفسیاتی، جذباتی اور ذہنی رویے متاثر ہوئے ہیں۔

ہر تجربہ اپنے منفرد ومخصوص، لسانی، ہیئتی اور تکنیکی زبان واسلوب کا متقاضی ہوتا ہے۔ اردو افسانے کے جدید دور میں جب جدیدیت کا بخار ہر طرف وبائی صورت اختیار کر چکا تھا، بھی لاتعداد افسانہ نگار ایسے ہوئے جنہوں نے اینٹی سٹوری اور لایعنیت والے تجریدی افسانے تخلیق کئے۔ اس طرح کے افسانوں کو بھی علامتی افسانوں کے ساتھ گڑ مڑ کیا گیا۔ ایسے افسانے فوراً ہی دم توڑ گئے، لیکن صحت مند علامتی افسانے آج تک باقاعدگی کے ساتھ اُفق ادب پر نمودار ہوتے ہی رہتے ہیں، حالانکہ دونوں طرح کے افسانے لکھنے والوں میں خالدہ حسین، احمد ہمیش، قمر احسن، سلام بن رزاق، کمار پاشی، بلراج کومل، انور سجاد، رشید امجد، احمد یوسف کے علاوہ بھی بہت سے اردو افسانہ نگار شامل رہے ہیں۔

افسانوں میں ڈرامائی واقعات، داستانوی رموزیت، حیرانگی وتجسس، بیانیہ اور لسانی موزونیت، تخلیقی استعجاب، منطق، اساطیری داستانوی یا حکایتی اندازِ بیان بازگوئی کے لئے بنیاد فراہم کرتے ہیں۔ ان کی بنیاد ہر افسانوی بازگوئی میں کسی تخیلی کردار یا واقعے کو نئے حسب حال عصری ماحول ومنظرنامے میں بیان کرنا یافٹ کرنا واقعی کاردار دوالا معاملہ ہے۔ اسے ایسے ہی سمجھنا چاہیے کہ دقیانوس کے زمانے کا کوئی مردہ زندہ ہوکر موجودہ دور کے انسانوں کی کسی بستی میں زندگی گزارنے لگے۔ اس ضمن میں سریندر پرکاش کے شاہکار افسانے ''بجوکا'' کی مثال دی جاسکتی ہے جو بازگوئی کی ایک اچھی مثال ہے کہ اس میں پریم چند کے ناول ''گئودان'' کا مرکزی کردار ''ہوری'' اپنے افرادِ خانہ کے ساتھ دوبارہ زندہ ہوتا ہے اور سب کچھ بدلا بدلا سا محسوس کرنے کے باوجود بھی اسی ماحول میں ان ہی لوگوں کے اردگرد اپنے آپ کو پاتا ہے اور یہ عمل افسانے کے اختتام کے باوجود بھی جیسے ختم نہیں ہوتا بلکہ جاری رہتا ہے۔

وحشی سعید کے اکثر افسانے اسی بازگوئی پر مبنی ہیں، جن میں داستانی، تمثیلی یا حکایتی پیرائیہ اظہار ہے۔ روایاتی، تخلیقی اور بیانیاتی توسیع وترویج بھی ہے ان لازمی عناصر کی خوبصورت آمیزش بھی ہے۔ اس ضمن میں انتظار حسین کے افسانے ''کشتی''، ''گل گمیش'' وغیرہ کی مثال یا پھر مظہر سلیم کے ''چرواہا'' کی مثال بھی دی جاسکتی ہے۔

وحشی سعید نے کئی کیا اکثر علامتی افسانے خاص کرتب سے جب سے وہ دوبارہ ایک عرصہ کی صحرانوردی کے بعد افسانوی دنیا میں لوٹ آئے، لکھے ہیں۔ افسانے تخلیق کرنے کا ان کا پرانا اسٹائیل یکسر تبدیل ہوگیا کہ انہوں نے اسی بازگوئی کو اختیار کرلیا۔ وجوہات واسباب وحشی سعید ہی بخوبی جانتے ہوں گے۔ ہم صرف یہ جانتے ہیں کہ ان کی اس بازگوئی نے اردو کو کئی اچھے افسانے دیئے جن میں ''کب آئے گا سقراط''، ''میرا قاتل میرا مسیحا''، ''عجائب گھر کا طوطا''، ''شہنشاہ قاتل تلوار''، ''قاتل مقتول چور پولیس'' اور اب ''سقراط کی واپسی'' شامل ہیں۔

جہاں تک زیر تجزیہ افسانہ ارسطو کی واپسی کا تعلق ہے یہ وحشی سعید کا تازہ ترین علامتی افسانہ ہے۔اس افسانے میں بھی باز گوئی کی تکنیک کا استعمال کیا گیا ہے۔ باز گوئی کے متعلق مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ پرانے اساطیری مواد کے دوبارہ تخلیقی استعمال کو باز گوئی کہا جاتا ہے۔ باز یافت یا باز تخلیق کی روایت قدیم وجدید ادب میں موجود ہے اور مقبول بھی ہے۔ ماضی کی تخلیقات سے استفادہ تلمیحی حوالوں یا اشاروں کے روپ میں اردو ادب کی تقریباً تمام اصناف ادب میں موجود رہی ہیں اور آج بھی ہیں۔ کسی بھی واقعے کی ذہن میں بازگشت کو منفرد فکری، فنی اور معنوی ارتباط یا تلمیحی استعمال کی روایت بہت پرانی ہے۔

کسی واقعے یا روایت کا جزوی یا کلی حوالہ اگر نظم یا نثر میں آجائے تو اس میں تمثیل وحکایت اور داستان طرازی کا رنگ غالب آجاتا ہے اور تخلیق میں اصل موضوع کی معنویت دوبالا ہو جاتی ہے یا پھر اسے آرائش خیال کے لئے استعمال میں لایا جاتا ہے اور اگر پہلے ہی سے تخلیق کا موضوع داستانی یا حکایتی نوعیت کا ہو تو اس کی مقبولیت کے ساتھ ساتھ اس کی فنی اور فکری نوعیت بدل جاتی ہے اور حوالے کی حیثیت مزید اہمیت وافادیت اختیار کر لیتی ہے۔

بات ''ارسطو کی واپسی'' کی چل رہی ہے۔ افسانے کی شروعات ''جہاں سقراط کے سفر کا اختتام ہوا وہیں سے ارسطو کا سفر شروع ہوا'' کے جملے سے ہوتی ہے۔ ظاہر بات ہے اس ابتدائی سطر یا جملے سے ہی اس کے تمثیلی یا حکایتی انداز بیان یا پھر باز گوئی کا آغاز ہوتا ہے۔

سقراط، بقراط، ارسطو، پیتھا گورس، افلاطون سب قدیم یونانی مفکرین ہیں۔ صدیاں گزر جانے کے باوجود بھی اب تک ان کی زندگی واقوال مثالی بنے ہوئے ہیں۔ زیر نظر تجزیہ افسانہ کے افسانہ نگار نے اس بار ارسطو اور اس کے شاگرد ۔ ۔ ۔ اور فاتح عالم سکندر اعظم کے واقعے کو اپنے افسانے کے اصل پلاٹ کے ساتھ داستان طرازی کے لئے منتخب کیا ہے۔

وحشی سعید افسانے کے دوسرے پیرا گراف میں سقراط، ارسطو اور سکندر کی دنیا سے لوٹ کر اپنے گھر کے بیڈروم میں آجاتے ہیں۔ جب تاریخ کی کتابوں میں ارسطو کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے ایک زوردار دھماکہ سے پوری کائنات جیسے دہل جاتی ہے اور رات کا سناٹا چیخوں اور آہ وبکا کی نذر ہو جاتا ہے اور گولیوں کی دن دھناہٹ میں اسے یہ محسوس ہوتا ہے کہ شاید یہ زندگی کا آخری سفر ہے۔

پھر جب دوبارہ خاموشی لوٹنے لگتی ہے اور ہنگامہ اور شور شرابہ سرگوشیوں کا روپ دھارن کر لیتا ہے تو افسانہ نگار افسانے کا رُخ دوسری جانب موڑ لیتا ہے۔

فاتح عالم سکندر اعظم کی ہندوستان کی طرف جسے سونے کی چڑیا سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

قبل از مسیح کے ہزاروں سال پرانے اس واقعے سے دفعتاً پھر افسانہ نگار عصر حاضر میں ایک ڈیڑھ ماہ قبل پیش آجانے والے واقعے کی طرف آجاتے ہیں جب کشمیر میں ہندوستانی فوج کے ایک آفیسر نے ایک نہتے نوجوان دیہاتی کو اپنی بکتر بند فوجی گاڑی کے سامنے رسیوں سے باندھ کر انسانی ڈھال کے طور پر استعمال کیا۔

وحشی سعید ارسطو کی اس نصیحت کی طرف آجاتے ہیں جو اُس نے سکندر اعظم سے کی تھی، جس کا پہلا سبق یہ تھا کہ "فوج کے ایک کامل کمانڈر جو بہت جلد فاتح عالم بننے جا رہے تھے، کہ اسے یاد رکھنا ہوگا کہ وہ انسانوں اور انسانی اقدار کو کبھی پامال نہ ہونے دے گا اور دشمن کی پسپائی اس کی انا کو غرور میں مبتلا نہ کردے۔

سکندر اعظم نے ہندوستان کو فتح کیا۔ راجہ پورس کو زنجیروں میں جکڑ کر سکندر اعظم کے حضور پیش کیا گیا۔ سکندر نے تمام درباریوں کی موجودگی میں شکست خوردہ راجا پورس سے دریافت کیا کہ اب اُس کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے؟

راجا پورس نے کسی گھبراہٹ کے بغیر ہی جواب دیا ۔ ۔

''جو ایک بادشاہ، بادشاہ کے ساتھ کرتا ہے'' دربار میں موجود درباریوں کا خیال تھا کہ راجا پورس نے اس جرأت مندرانہ جواب سے فاتح عالم سکندر اعظم کے غیض وغضب کو دعوت دی۔ لیکن سکندر اعظم اُن کے اندیشوں کے برعکس یہ حکم صادر فرماتے ہیں کہ راجا پورس کو باعزت آزاد کردیا جائے کہ اسے اپنے استاد ارسطو کی نصیحت یاد آجاتی ہے کہ ''تم انسانی اقدار کو پامال نہیں ہونے دو گے''

پھر سکندر اور پورس آپس میں بغل گیر ہوجاتے ہیں۔

اس منظر کے بعد پھر پردہ کھسکتا ہے اور پھر اسی عام دیہاتی کی بات کو آگے بڑھایا جاتا ہے جسے فوجی انسانی ڈھال بنا کر بکتر بند گاڑی کے آگے باندھ کر سنسان وویران گلیوں اور سڑکوں پر گھما کر اپنی فتح کا جشن مناتے ہیں۔

سکندر اعظم جب وطن واپس لوٹنے لگے تو راجا پورس نے تشکر بھری نظروں سے اُسے وداع کیا اور اس طرح سے مقدونیہ کا بادشاہ تواریخ کے صفحات پر ایک ناقابل فراموش فاتح عالم بن گیا اور رہتی دنیا تک انسانی ہمدردی اور اخلاقی بلندی و وسیع القلبی کی انمٹ داستان رقم کر گیا۔

اور پھر ۔ ۔ ۔ وہ دن آگیا جس دن کی صبح وشام سیاہ تھی، جو دن انسانی تواریخ پہ ایک سیاہ دھبہ بن کر آیا۔ جس دن ایک عام نہتے، بے قصور اور معصوم شہری کو اس کے جرم بے گناہی پر انسانی ڈھال بنایا گیا اور تمام تر اخلاقی اصول وقواعد کو پامال کیا گیا۔ یہ ناپسندیدہ فعل انجام دینے والے فوجی کی نہ صرف پیٹھ تھپ تھپائی گئی بلکہ اسے انعام واکرام، اعزاز اور تمغۂ جرأت سے بھی نوازا گیا۔ اور انسان کو ذلیل وخوار اور انسانیت کو رسوا کیا گیا۔

''ارسطو کی واپسی'' افسانے کا اختتام اس خوبصورت انداز سے کیا گیا ہے جو اس افسانے کا حاصل ہے ارسطو نے اپنے عظیم شاگرد سکندر اعظم کی موت پر آنسو نہیں بہائے کیونکہ سکندر انسانی تواریخ کا امر حصہ بن گیا تھا۔ کئی ہزار سال گزر چکے جب ارسطو کی واپسی ہوئی، لیکن اس ارسطو کی آنکھیں خون کے آنسو بہا رہی تھیں۔

افسانے کی ان آخری سطور میں صدیوں پہلے کی انسانی اقدار کا موازنہ موجودہ دور کی انسانی اقدار سے کیا گیا ہے اور ان کی اس قدر شکست و ریخت اور پامالی پر کچھ کہے یا فتویٰ صادر کئے بغیر ہی انسانی عقل و شعور کو کریدتا ہوا ایک سوالیہ نشان لگایا گیا ہے جو اس افسانے کا لب لباب ہے۔ وہ اس لئے بھی کہ سکندر اور پورس کا واقعہ زبان زد ہر خاص و عام ہے اور اس گھسے پٹے رٹے رٹائے تاریخی واقعے کو موجودہ سیاسی حالات کے ساتھ جن سے پوری کشمیری قوم جوجھ رہی ہے مرتبط کرنا ہی افسانہ نگاری ہے اور اسی کو افسانوی زبان میں بازگوئی بھی کہتے ہیں۔



سامری

دنیا کی سب سے اونچی چوٹی ہمالیہ پر پہلے انسانی قدم ہیلری کے پڑے تھے۔ اس مرد آہن نے دنیا کی سب سے اونچی چوٹی پر جو پہلا جھنڈا لہرایا تھا، امن کا وہ جھنڈا تھا جس کو سفید کبوتروں کا جھنڈ چھوتے ہوئے فضاؤں میں اونچی اُڑان بھرتے ہوئے نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ اس عظیم چوٹی پر ہیلری کے ساتھی ٹین زنگ نے اپنی بانہوں کو فضاؤں میں پھیلایا اور اُس کو یوں لگا کہ اُس نے اپنے اندر ساری دنیا کو جذب کرلیا۔

پون صدی پہلے شہر آسٹریا میں ایک ایسے بچے کی پیدائش ہوئی جو دنیا کا چہرہ بدلنے والا تھا۔ اُس بچے کو اپنے آرین "Aryan" ہونے پر ناز تھا۔ خود کو تمام انسانوں سے بالاتر سمجھتا تھا۔ وہ اپنے سے بڑے بچوں پر دبدبہ بنائے رکھنے کا فن بھی جانتا تھا۔ وہ تیز اور طرار تھا۔ باتیں بنانے میں ماہر تھا۔ باتوں کے جادو میں کسی بھی عمر کے کسی بھی فرد کو شیشے میں اُتار لیتا تھا۔ اس لئے بچپن میں ہی اُس کے حلقۂ اثر کے بچے اُس کو سامری نام سے پکارنے لگے۔

یہ نیا سامری اُن سے مخاطب ہوکر کہتا ۔ ۔ ۔

''میں ایک ایسی دنیا ترتیب دینے والا ہوں جہاں یہ عظیم حسب ونسب کا آرین حکمران ہوگا''

وہ اپنے والد کا چوتھا بیٹا تھا۔ اُس کا والد اپنے اس چوتھے بیٹے کی غصیلی طبیعت سے پریشان رہتا تھا۔ اُس کو ہر وقت یہ فکر لگی رہتی تھی کہ کہیں وہ اس غصیلی طبیعت کے بیٹے کی وجہ سے

کسی مصیبت میں گرفتار نہ ہو۔ اکثر باپ بیٹے میں تو تو میں میں ہوتی۔ کبھی کبھی یہ تو تو میں میں جھگڑے کی صورت اختیار کرتی تھی۔ پھر ایک دن وہ بچہ آسٹریا سے نکل کر جرمنی پہنچ گیا۔

ہیلری نے جب ہمالیہ کی چوٹی پر امن کا جھنڈا لہرایا۔ ہمالیہ سے کئی ہزار میل دور سمندر کو چھوتے ہوئے ایک شہر میں ریڈی پر چائے بیچنے والے کے ہاں چوتھی اولاد پیدا ہوئی۔ افلاس میں ڈوبے ہوئے اس چائے والے نے اپنی اولاد کی پیدائش پر مٹھائی کے چند ٹکڑے بھی نہ بانٹے۔ نوزائید بچے نے روتے ہوئے گھر کو سر پر اُٹھایا جیسے وہ اپنی آمد کا اعلان کر رہا تھا۔

اس بچے کی آمد کے بعد اس گھر کے مالک کی ریڈی پر چائے بیچنے پر جو تھوڑی بہت آمدنی ہو رہی تھی وہ بھی قدرے کم ہوگئی۔ گھر کے افراد افلاس کے ایسے اندھیرے میں ڈوب گئے جہاں روشنی دور دور تک نظر نہیں آرہی تھی۔ نوزائید بچے کو گود میں اُٹھانے کے لئے کوئی تیار نہیں تھا۔ سب ہی یک زبان بولتے ۔ ۔ ”یہ تو منحوس ہے“

لیکن ماں تو ماں ہوتی ہے۔ وہ اپنے نوزائید بچے کو اپنی سوکھی ہوئی چھاتیوں سے دودھ پلا رہی تھی۔ اُس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا دریا بہہ رہا تھا۔ روتے ہوئے ہچکیاں لیتے ہوئے اپنے بیٹے کی پیٹ کو سہلاتے ہوئے کہتی ۔ ۔ ۔

”سو جاؤ ۔ ۔ راجا بیٹے سو جاؤ“

یہ میلا کچیلا بچہ جیسے جیسے بڑا ہونے لگا تو وہ باتوں کا بادشاہ بن گیا۔ سب کا دل اپنی باتوں سے موہ لیتا تھا۔ والد کی ریڈی سڑک سے اسٹیشن پر پہنچ گئی۔ کم سن ہونے کے باوجود چائے کی ریڈی میں اُس کی مدد کرتا تھا۔

اب یہ بچہ سولہ سال کا ہوگیا۔ والد کے لئے کل کا میلا کچیلا بچہ قیمتی بن گیا۔ اس لئے وہ شادی کے منڈپ میں نیلام ہوگیا۔ پیسوں کا لین دین ہوا۔ سہاگ رات میں یہ ہکا بکا دولہا بھاگ

کھڑا ہو گیا۔ سادھوؤں کی ٹولی کے ساتھ ہمالیہ کی شرن میں آ گیا۔ وہ خود کو یا اُن ساروں کو اس مغالطے میں رکھنا چاہتا تھا کہ وہ گیانی بن گیا۔ لیکن وہ ایک ایسے جادو کی تلاش میں تھا جو اُس کو سامری بنا دے۔

میانہ قد کا وہ نوجوان میونک "Munich" کے تاریخی شہر میں جب پہنچا، اُسے یوں لگا اُس شہر کی بھول بھلیوں میں وہ کھو جائے گا۔ لیکن اُس کو بہت جلد احساس ہوا کہ زندگی میں اگر مجھے اوپر آنا ہے تو مجھے اپنے آپ کو ان بھول بھلیوں کے حوالے نہیں کرنا ہے۔ اُس کو زندگی شروع کرنے کے لئے ایک ضابطے کے تحت کام کرنا ہوگا۔ وہ فوج میں شامل ہو گیا۔ فوجی ٹریننگ کے دوران وہ ڈاکیہ کا کام کرتا رہا جس کو اُس نے بخوبی انجام دیا۔ وہ قابل تعریف بن گیا۔ بڑے سے بڑا افسر اُس کی ذہانت اور قابلیت کے قائل ہو گئے۔ لیکن اُس کا نیا ملک عبرت ناک شکست سے دوچار ہوا۔ وہ اس شکست سے اتنا بددل ہو گیا کہ اُس نے فوج سے علیحدگی اختیار کی۔ پھر وہ سڑک پر آ گیا۔ ہزاروں لوگوں کے ساتھ مظاہروں میں شامل ہو گیا۔

پھر ایک دن خود کو اُس نے لوگوں کے ایک بڑے ہجوم سے خطاب کرتے ہوئے پایا۔ اُس نے تقریر کرتے ہوئے اپنی نئی قوم کی شان و شوکت اور وحدت کے قصیدے پڑھے۔ لوگوں کا وہ ہجوم اس قدر اُس کا گرویدہ ہو گیا کہ سب ایک ساتھ بول پڑے ۔ ۔

''قوم کا لیڈر کیسا ہو؟ سامری جیسا ہو، ۔ ۔ سامری ۔ ۔ سامری ۔ ۔ سامری''

وہ ایک ایسا سامری بنا جس نے ساری قوم کو اپنے جادو سے باندھ لیا۔

ہمالیہ کے دامن میں سادھوؤں کے ٹولے کے ساتھ آیا ہوا وہ سترہ سالہ لڑکا اپنے بُنے ہوئے الجھنوں کے جال سے آزاد نہیں ہو رہا تھا۔ وہ اپنے الجھنوں سے اس قدر پریشان تھا کہ اُس کی آنکھوں سے آنسو گنگا جمنا بن کر بہنے لگے۔ پھر ایک دن سادھوؤں کی ٹولی میں ایک بوڑھا سادھو

اُس کے سامنے کھڑا ہوا۔ اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا ۔ ۔

''اُٹھ ۔ ۔ کھڑا ہو ۔ ۔ روتے نہیں''

پھر اُس نے اپنے کندھے سے اپنا زعفرانی گچھا اُس کے کندھوں پر سجایا۔ اُس کے آنسوؤں کو پونچھتے ہوئے بولا ۔ ۔

''جا ۔ ۔ واپس جا''

اُنیس سالہ وہ لڑکا ایک نئے شہر میں چلا گیا۔ وہ شہر بھی سمندر کو چھوتا تھا۔ لیکن اس شہر کی رونق آسمان کو چھو رہی تھی۔ اس شہر کے اندر ایک اور شہر بسا ہوا تھا۔ وہیں اُس کو اُس کی پناہ گاہ ملی۔ اُس پناہ گاہ میں اُس کی زندگی کا راستہ مقرر ہوا۔ وہیں اُس کو سامری بننے کا پہلا سبق ملا۔

وقت کے حکمرانوں نے جب اُس درمیانہ قد کے خوبصورت نوجوان کی بڑھتی ہوئی عوامی مقبولیت دیکھی تو انہوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ وہ درمیانہ قد کا خوبصورت آدمی ایک ایسا نازی بنا جس نے حکمرانوں کے ایوانوں کو قہر رجال سے نیست و نابود کر دیا۔

اُس نے اپنی قوم کو یہ یقین دلایا کہ وہ اُن کی کھوئی ہوئی عزت نفس واپس دلائے گا۔ وہ بولا ۔ ۔

> ''اب وقت آ گیا ہے، یہ قوم تمام دنیا پر حکومت کرے گی۔ اب ہمیں اس سے کوئی نہیں روک سکتا۔ ہمارے حکمرانوں نے ہمیں جس شکست سے دوچار کرایا وہ شکست قصہ پارینہ بنے گی۔ آپ مجھے چن لیجئے، میں آپ کے قدموں پہ دنیا کو جھکا دوں گا''

میانہ قد کا خوبصورت آدمی ایک ایسا سامری تھا جس کا جادو عوام کے سر چڑھ کے بولا۔ کل کا ریڈی پر چائے بیچنے والا تعلیم یافتہ ہو گیا۔ وقت نے اُس کو وہاں پہنچا دیا جہاں صرف دوسرے تصور کر سکتے ہیں۔

وہ ایک مخصوص سوچ کا تابع دار بن گیا۔ زندگی کے ہر مسئلے کو سوچ کی کسوٹی پر پرکھنے لگا۔ اُس کے بولنے کا انداز بدل گیا۔ وہ جب بولتا، یوں لگتا پھول جھڑتا ہے۔ مخصوص سوچ کے لوگوں کو لگا کہ اُن کو اُن کا مسیحا مل گیا۔ ایسا مسیحا جس کی اُن کو صدیوں سے تلاش تھی۔ وہ ایک دوسرے سے بولتے ۔ ۔

''یہی سوچ ہماری قوم کو سب قوموں سے آگے لے جائے گی''

اس لئے وہ اہم تنظیم کا اہم کارکن بن گیا۔ وہ قسمت کا دھنی تھا۔ عمر رسیدہ لوگ بھی اُس کے سامنے سر جھکائے کھڑے رہنے لگے۔ ہر کامیابی کے بعد اُس کا قد بڑھتا گیا۔ مورخین تاریخ کے اوراق سے اُس جیسا ثانی نہ پا سکے۔ وہ لوگوں کو یقین دلاتا ۔ ۔

''صدیوں سے آپ لوگوں نے جو رتبہ کھویا ہے، وہ میں آپ لوگوں کو واپس دلاؤں گا''

وہ مزید بولا ۔ ۔

''آپ میرے ساتھ ساتھ چلو۔ آپ نے جو صرف تصور کیا ہو، اُس خواب کو اس تصویر کو میں حقیقت میں بدلنے والا ہوں''

لاکھوں لوگوں کا ہجوم ایک ساتھ کھڑا ہو کر ایک ساتھ بولا ۔ ۔

''سامری ۔ ۔ سامری ۔ ۔ سامری''

سامری نے سب کو اپنے جادو کے دھاگے میں باندھا۔ سامری کے سامنے ملکوں کے ساتھ کئے گئے وعدے، دستاویز، ردی کے کاغذ سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے۔ ایسے دستاویز نے ملک کی عزت نفس کو گروی رکھا تھا۔ سامری نے اپنی طاقت کا مظاہرہ کیا۔ ملک کے بعد ملک فتح کرتا گیا۔ وہ عوام کو اپنی خوش گفتار آواز میں بولتا تھا ۔ ۔ ۔

''میں نہ کہتا تھا کہ ہم تمام قوموں پر حکومت کرنے کے لئے پیدا ہوئے۔ ہماری قوم سب سے بلند اور اونچی ہے''

سامری کا سانحہ یہ ہے۔ یہی اُس کی حقیقت بھی ہے کہ وہ صرف جادوگر ہے۔ صرف جادوگر ہے۔ ایک ایسا جادوگر جس کی جان کسی طوطے میں اٹکی ہوئی ہے۔ تکبر اور غرور سامری کو اس حقیقت سے غافل کرتا۔

پھر موسم بدلا۔ ماحول بدلا۔ کل جہاں مہکتے ہوئے پھول تھے، گاتے ہوئے پرندے تھے۔ آج وہاں بارشوں نے کہرام مچا رکھا۔ برف کے ان چاہے پہاڑ کھڑے ہوئے سامری نے کبھی یہ نہ سوچا تھا کہ اُس کی جیالہ فوج نے ملک بعد ملک اپنے پاؤں تلے روندھے تھے۔ وہ فوج برف کی قبر میں دفن ہو گی۔

سامری کا یہ طوطا اُس کے قابو میں نہیں آیا۔ وہ جنگ پہ جنگ ہارتا گیا۔ سامری کا طوطا برف میں دب کے رہ گیا۔ اب ہارے ہوئے سامری نے زندگی کو الوداع کہا۔ کیا اُس کے پاس کوئی اور راستہ نہ تھا ۔ ۔ ؟

وہ جو خود کو ساری دنیا کا حکمران بننے کا خواب سجائے ہوئے ایک چھوٹے کمرے میں دفن ہو گیا، اب وہ صرف تاریخ کے صفحوں میں گم ہو گیا۔ ایک پوری صدی کے لئے اُس کی قوم اپنی شناخت کھو بیٹھی۔

پسماندہ قوم کا ایک نیا سامری ہر تقریر میں سنہرے خوابوں کو حقیقت میں بدلنے کا وعدہ کرتے ہوئے نظر آ رہا ہے۔ وہ اُن کی سوچ کا مسیحا نظر آ رہا ہے۔ سب کے سب اُس کے پیچھے چلتے نظر آ رہے ہیں۔ ہجوم در ہجوم بلند سے بلند آواز میں کہتے ہیں ۔ ۔

''سامری ۔ ۔ ۔ سامری ۔ ۔ ۔ سامری''

خوبصورت خوابوں کا سوداگر انسانوں کی قربانی دیتا ہے۔ جانوروں کی پرستش کرتا ہے۔

ہم میں چنداب بھی اس انتظار میں ہیں کہ کوئی تو ہوگا جو ہمالیہ کی اونچی چوٹی پر امن کا جھنڈا لہرائے گا اور سفید کبوتروں کا جُھنڈ اس سفید جھنڈے کو چھوتے ہوئے فضاؤں میں اُڑان بھرے گا۔



تجزیہ نگار :
ڈاکٹر ظہیر انصاری

سامری
تجزیہ

دنیا میں جس تیزی سے خود پرستی کا غلبہ ہوتا جارہا ہے، یہ فرد سے نکل کر جماعت، جماعتوں سے نکل کر قوم اور قوموں سے نکل کر حکومت تک پہنچ گئی ہے۔ اب تو شبہ ہوتا ہے کہ جماعت افراد کے مجموعے کا نام ہے یا قوم مختلف جماعتوں کے ملنے سے ترتیب پائی ہے یا حکومتیں مختلف الخیال یا ہم خیال پارٹیوں کا مجموع ہیں۔ ہر صورت میں یک شخصی یا یک قطبی غلبے کا گمان ہوتا ہے۔ اگرچہ یہ جمہوریت کی روح کے منافی ہے مگر جمہوریت کی آڑ میں بادشاہت کو فروغ دینے جیسا ہے۔ جمہوریت اور بادشاہت کے بیچ میں اب ایک ہلکی سی لکیر رہ گئی ہے جس کے مٹ جانے میں کوئی دیر نہیں ۔ ۔ اور بادشاہت تو خود پرستی کا ہی دوسرا نام ہے جہاں سے فاشزم کی شروعات ہوتی ہے۔ خود پرستی سے ''پروٹیکشنزم'' یعنی تحفظ کی داغ بیل پڑتی ہے اور ''تحفظ'' انتہائی قوم پرستی کی جانب دھکیلتا ہے۔ انتہائی قوم پرستی کے سرایت کر جانے سے ملک تباہ و برباد ہو جاتا ہے۔

ادیب یا شاعر سماج کا ایک حساس فرد ہوتا ہے۔ وہ اپنی آنکھ اور کان دوسرے لوگوں کی بہ نسبت زیادہ کھلا رکھتا ہے۔ اپنے اطراف جو دیکھتا ہے اُسی کو اپنے فن پارے میں پرو دیتا ہے۔ اگرچہ وہ تاریخ نہیں لکھ رہا ہوتا ہے لیکن بادی النظر میں وہ تاریخ ہی کا حصہ ہوتا ہے۔ جیسا کہ مشاہد کیا جارہا ہے کہ دنیا ایک چھوٹے سے گاؤں میں بدل گئی ہے بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ دنیا اب لوگوں کی ہتھیلیوں پر آ گئی ہے۔ پل پل کی خبریں منٹوں کیا بلکہ سیکنڈوں میں دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے پر پہنچ رہی ہیں جس کی وجہ سے عام لوگ تو متاثر ہو ہی رہے ہیں، وہیں ادیب وشاعر کا بے چین ہو جانا فطری ہے۔

ادھر چار پانچ برسوں میں جہاں دنیا کے حالات تیزی سے بدلے ہیں وہیں ہندوستان میں بھی ایک بڑی تبدیلی رونما ہوئی ہے جس میں جبری قوم پرستی سرفہرست ہے۔ اس کے علاوہ جھوٹ اور وعدہ خلافی کا ایک لامتناہی سلسلہ چل پڑا ہے جو افسانہ نگاروں کو اسی تناظر میں فکشن تخلیق کرنے پر آمادہ کررہا ہے۔ مشرف عالم ذوقی نے ''گلیشیر ٹوٹ رہے تھے اور ۔ ۔ '' لکھ کر قاری کو سحرزدہ تو کیا ہی وہیں بھیونڈی کی شمع اختر کاظمی نے ''راون زندہ ہے'' نامی افسانہ لکھ کر ایک ایسا نقش ثبت کیا کہ لوگ آج بھی یاد کرتے ہیں۔ یہ افسانے اور اس طرح کے دیگر افسانے 17 - 2016ء میں لکھے گئے ہیں اور موجودہ حکومت کی کارکردگی پر طنز ہیں۔ وحشی سعید بھلا کیوں پیچھے رہتے۔ انہوں نے بھی اِن برسوں میں ''نور کا نور کہاں ہے''، ''کیا راون مرے گا؟''، ''سزا کس جرم کی''، ''پوسٹر'' اور ''ارسطو کی واپسی'' وغیرہ افسانے لکھ کر یہ ثابت کیا کہ اہل سیاست یا حکمران نہ صرف نااہل ہیں بلکہ ان کے ارادے اور نیت بھی ٹھیک نہیں ہیں۔

وحشی سعید کشمیر کے مایہ ناز فکشن نگار ہیں۔ پروفیسر حامدی کاشمیری، شمس الرحمٰن فاروقی، پروفیسر قدوس جاوید، نور شاہ، رشید امجد، ڈاکٹر اشرف آثاری وغیرہ بھی ان کی نئی تکنیک کے دلدادہ ہیں جو وہ ماضی سے حال کو اپنی کہانیوں کے ذریعے جس خوبی کے ساتھ جوڑتے ہیں وہ صرف انہیں

کا خاصہ ہے۔ اب تو ملک اور بیرون ملک کے ناقدین بھی متوجہ ہوئے ہیں اور ان کی اس نئی تکنیک پر کلام کرنے لگے ہیں۔ ان کی کہانیاں علامتی ہونے کے باوجود قاری کو بوجھل نہیں کرتیں اور وہ اپنے اپنے طور پر مطلب نکال لیتا ہے اور سمجھ بھی جاتا ہے۔ یہی افسانے کی کامیابی بھی ہے۔

زیر نظر افسانہ ''سامری'' کے عنوان سے ہی تجسس پیدا ہونے لگتا ہے اور قاری یہ سمجھنے لگتا ہے کہ ہو نہ ہو جادو ٹونے اور کسی جادوگر کی کہانی ہمیں پڑھنے کو ملے گی۔ دراصل یہ کہانی اُس جادو ٹونے سے بھی بڑھ کر ہے اور وحشی سعید نے جس حقیقت اور جس ماضی کی طرف اشارہ کیا ہے اور پھر حال سے جس طرح جوڑا ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ ہر زمانے میں ایک ہٹلر پیدا ہوتا ہے۔ حالانکہ اس افسانے میں اس نام کا ذکر تک نہیں ہے لیکن قاری بہ آسانی سمجھ جاتا ہے کہ یہ وہی شخص ہے اور اسی کے اردگرد کہانی گھوم رہی ہے اور ہر جگہ ہر ملک میں کوئی نہ کوئی ہٹلر پایا جاتا ہے جس کی خصوصیات اُس ہٹلر سے ملتی جلتی ہیں۔ اگرچہ سوشل میڈیا کے اس دور میں ہٹلر کے موازنے کم دیکھنے کو نہیں ملے ہیں لیکن جس خوبی کے ساتھ وحشی سعید نے یہ کہانی بُنی ہے، نگاہیں جاکر وہیں ٹکتی ہیں اور بے ساختہ زبان سے یہ نکلتا ہے کہ یہ ''آج کا ہٹلر'' ہے۔

کچھ لوگ ہوتے ہیں جو ہتھیلی پر چاند دکھاتے ہیں۔ اُنہیں لوگوں کو قائل کرنا آتا ہے، اپنی بات سے، اپنی تقریر سے، اپنی اداؤں سے۔ لوگ اُن کے جال میں پھنستے چلے جاتے ہیں۔ وہ بہت بڑے اداکار ہوتے ہیں۔ وہ ایسے ڈائیلاگ ادا کرتے ہیں کہ لوگ عش عش کرتے ہیں۔ لگتا ہی نہیں ہے کہ وہ کوئی جھوٹ بول رہے ہیں اور لوگ یقین کرنے لگتے ہیں۔ یہ ایک طرح کی صفت ہے جو سب میں نہیں ہوتی اور اسی کا فائدہ اُٹھا کر وہ لوگوں کے اندر قوم پرستی کا جذبہ اُنڈیلتے ہیں۔

وحشی سعید نے اسی کی طرف اشارہ کیا ہے جب وہ ایسے ہی کردار کے بارے میں اس افسانے میں اُسی سے یہ جملہ کہلواتے ہیں کہ ۔۔۔

''صدیوں سے آپ لوگوں نے جو رتبہ کھویا ہے وہ میں آپ لوگوں کو واپس
دلاؤں گا''

''لاکھوں لوگوں کا ہجوم ایک ساتھ کھڑا ہوکرایک ساتھ بولا ۔ ۔ ۔

سامری ۔ ۔ سامری ۔ ۔ سامری ۔ ۔ ''

کسے پسند نہیں ہے کھوئے ہوئے رتبے کو حاصل کرنا لیکن کیا یہ ممکن ہے؟ اور یہ کھویا ہوا رُتبہ ہے کیا؟ سامری کو پتہ بھی ہے یا اپنے لوگوں کو وہ صرف بہکا رہا ہے۔ زمانہ بدل چکا ہے، یہ اُسے بہتر معلوم ہے۔ مساوات کا چلن عام ہے، یہ بھی اُسے اچھی طرح معلوم ہے لیکن جس رُتبے کو وہ واپس دلانے کی بات کرتا ہے، وہ جانتا ہے کہ ایسی باتیں کرکے ہی وہ اپنے لوگوں کے جذبات کو برانگیختہ کرسکتا ہے اوراس خواب کو زیادہ سے زیادہ طول بھی دے سکتا ہے۔ یہ ایک ایسا خواب ہے جو سراب رہتے ہوئے بھی دلکش ہے اوراس میں ایک حسین سحر بھی ہے۔
وحشی سعید آگے لکھتے ہیں ۔ ۔ ۔

''سامری نے سب کو اپنے جادو کے دھاگے میں باندھا۔ سامری کے سامنے ملکوں کے ساتھ کئے گئے وعدے، دستاویز، ردی کے کاغذ سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے۔ ایسے دستاویز نے ملک کی عزت نفس کو گروی رکھا تھا۔ سامری نے اپنی طاقت کا مظاہرکیا۔ ملک کے بعد ملک فتح کرتا گیا''

دراصل وحشی سعید نے کسی ملک کی ''پالیسی شفٹ'' کی طرف اشارہ کیا ہے اوراس سامری کے ذریعے جو پالیسی شفٹ ہوئی ہے اورآگے بھی یہی انداز برقراررہنے کی اُمید ہے، کو بحسن وخوبی بیان کیا ہے۔ کسی ملک کی خارجہ پالیسی طے کرنے کے وقت سابقہ حکومتوں کی پالیسیوں سے یوں ''یوٹرن'' لینا نہ صرف حماقت ہے بلکہ ہلاکت کا بھی سبب بن سکتا ہے۔ لیکن اس

سامری نے اپنے جادوئی اثر کو اس قدر برقرار رکھا ہے کہ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ جو بھی سامری کر رہا ہے وہ ان کے مفاد میں ہے اور اس سے ان کے وقار میں اضافہ ہوگا اور سابقہ حکومتوں نے جو کیا ہے وہ نہ ملک کے مفاد میں تھا اور نہ ہی اس کے شہریوں کے۔ اس لئے اُن کے معاہدوں کو وہ ردی کا کاغذ سمجھتا ہے۔ یہ صرف اور صرف خود پرستی ہے جس کی طرف وحشی سعید نے اشارہ کیا ہے۔ خود کو نمایاں کرنے اور تاریخ میں اپنا نام درج کرنے کی خاطر یہ سب حماقتیں کی جا رہی ہیں ورنہ ان کے نتائج سے سامری بھی واقف ہے۔

ہٹلر کا نام بھی تاریخ میں درج ہے لیکن منفی طور پر۔ اُس نے بھی اپنی قوم میں انتہائی قوم پرستی کے جذبات اُبھارے۔ وہ جب تقریر کرتا تو اپنے خطاب میں لوگوں سے پوچھتا۔۔

"قوم کا لیڈر کیسا ہو؟ سامری جیسا ہو، سامری۔۔ سامری۔۔ سامری۔۔"

"اب وقت آ گیا ہے یہ قوم تمام دنیا پر حکومت کرے گی۔ اب ہمیں اس سے کوئی روک نہیں سکتا۔ ہمارے حکمرانوں نے ہمیں جس شکست سے دو چار کرایا وہ شکست قصہ پارینہ بنے گی۔ آپ مجھے چُن لیجئے، میں آپ کے قدموں پر دنیا کو جھکا دوں گا"

سامری کا کردار ایک علامت ہے۔ چونکہ وحشی سعید علامت نگاری سے اپنی بات قاری تک پہنچانے کا ہنر خوب جانتے ہیں اس لئے اس نئے سامری سے جرمنی کے سامری کو ملا دیا ہے یا ایسا بھی کہا جا سکتا ہے کہ جرمنی کا سامری نیا جنم لے کر نمودار ہوا ہے اور اپنے کرتوتوں سے ملک کی شبیہہ کو داغ دار کر رہا ہے۔ اس کے چاہنے والے جنہیں بھکت کہا جا سکتا ہے اُس کی اندھی تقلید کرتے ہیں اور یہ بھی تو ہو رہا ہے کہ پے در پے اُس کی جیت بھکتوں کے یقین کو مستحکم کر رہی ہے اور ایسی جیت کے جذبے سے سرشار ہو کر سامری انتہائی قدم اُٹھاتا ہے۔

''خوبصورت خوابوں کا سوداگر انسانوں کی قربانی دیتا ہے۔ جانوروں کی پرستش کرتا ہے''

یہ جملہ نہ صرف بلیغ ہے بلکہ غضب ناک بھی ہے۔ جرمنی کا ہٹلر انسانوں کی قربانی تو دیتا تھا لیکن جانوروں کی پرستش کرتا تھا، اس کا ثبوت نہیں ملتا لیکن اس سامری کے نزدیک جانوروں کی جان کی حیثیت انسانوں سے زیادہ ہے۔ جانوروں کا تحفظ اور قتل یا موت اس سے برداشت نہیں ہوتا۔ ان کو بچانے کے لئے وہ سینکڑوں انسانوں کی قربانی دے سکتا ہے۔ یہ عجیب وڈمبنا (وِڈَم ب نا) ہے اور اِس سامری کو ممتاز کرتا ہے لیکن بغور جائیزہ لینے پر یہ راز کھلتا ہے کہ یہ سب دھوکہ ہے، نظر کا دھوکہ۔ یہ جانوروں کا برائے نام تحفظ بھی ایک ڈھونگ ہے۔ اس کی آڑ میں وہ مذہبی جذبات کا استحصال کرتا ہے اور اسی لئے وہ ایک کامیاب جادوگر ہے۔

لیکن وحشی سعید ملک کے لئے اچھا چاہتے ہیں۔ ملک اس جادوگر یعنی سامری سے کس طرح چھٹکارا پالے، اس کی کامنا بھی کرتے ہیں اور افسانے کے اختتام پر یہ جملہ لکھتے ہیں کہ ۔ ۔

''ہم میں چنداب بھی اس انتظار میں ہیں کہ کوئی تو ہوگا جو ہمالیہ کی اونچی چوٹی پر امن کا جھنڈا لہرائے گا اور سفید کبوتروں کا جھنڈ اس سفید جھنڈ کو چھوتے ہوئے فضاؤں میں اُڑان بھرے گا''

یہ بھی حسین اتفاق ہے کہ ہٹلر کی موت کے بعد ہی ہیلری کے قدم ہمالیہ کی سب سے اونچی چوٹی پر پڑے تھے اور اُس نے جو جھنڈا لہرایا تھا وہ امن کا جھنڈا تھا۔ وحشی سعید اس انتظار میں ہیں کہ کوئی آئے اور اسی طرح کا امن کا جھنڈا ہمالیہ کی سب سے اونچی چوٹی پر ایک بار پھر لہرائے، اس ہٹلر کی زندگی ہی میں ۔ ۔ اور پھر اس کی موت ہو۔ ویسے بھی اس کی عارضی اور علامتی ارتھیاں ملک کے مختلف حصوں میں اُٹھائی جارہی ہیں اور بعض جگہوں میں تو جلائی بھی جارہی ہیں۔

بھنگی

بھنگی کا لفظ جب زبان پر آتا ہے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ ہونٹوں تک ایک گالی چلی آئی ہے۔ اگر میں نے اُردو زبان کی لغات کو مرتب کیا ہوتا تو اس لفظ کو کبھی شامل نہ کرتا۔ لفظ کبھی برے نہیں ہوتے۔ دراصل یہ انسانی ذہن ہے جو لفظوں کو برا بناتا ہے۔ اور ان کو ایک ایسے ماحول کے سپرد کر دیتا ہے جہاں لفظوں کی اصلیت پر گند الحاف چڑھ جاتا ہے۔ جب بھی میں لال چوک کی سڑک سے ٹانگے پر سوار گھر کی طرف جاتا تو کسی نہ کسی بھنگی کو سڑک صاف کرتے ہوئے دیکھتا۔ ایسے لمحات پر اکثر آدمیوں کے منہ لٹک جاتے ہیں۔ تب میرا دل چیخنے لگتا اور میں خود سے کہتا ۔ ۔

''اٹھو اور لفظوں کا گندہ لحاف اُتار پھینک دو''

لیکن میرا یہ جذبہ تھوڑی دیر میں ٹھنڈا پڑ جاتا اور میں ایک بار پھر گھوڑے کی رفتار میں کھو جاتا۔ میں غور سے گھوڑے کی رفتار کو دیکھتا۔ آہستہ آہستہ اس کی اس رفتار میں ایک چہرہ نمودار ہوتا ۔ ۔ جانا پہچانا چہرہ ۔ ۔ ایک بھنگی کا چہرہ۔

وہ شروع سے آخر تک بھنگی تھا۔ صمد ۔ ۔ نہیں ۔ ۔ صمد بھنگی ۔ ۔ صمد بھنگی سے سرینگر کے ہر گلی کوچے واقف تھے۔ ہر سڑک کی اس نے گندگی اُٹھائی تھی۔ گندے اور صاف کوچے اور گلیاں صمد کو نہیں بھول سکتے۔ ایسا کون تھا جو صمد کو نہیں جانتا تھا۔ اس کا پتہ ہی ایسا تھا۔ وہ شرافت کا ایک پیکر مجسم تھا ۔ ۔ وہ انسان تھا ۔ ۔ لیکن ۔ ۔ ایک بھنگی تھا۔ اس لئے کبھی کسی نے اس کے انسان ہونے کا ذکر نہیں کیا۔

ہر آدمی کی کوئی نہ کوئی خواہش ہوتی ہے۔ صمد کی یہ خواہش تھی کہ اس کے گھر ایک اولاد پیدا ہو۔ اس نے خانقاہوں کی کھڑکیوں پر کپڑے باندھے، لیکن سب بے سود۔ وہ قدرت سے مایوس تھا، اس لئے اُداس رہتا تھا۔

ایک دن وہ مجھے غیر معمولی طور پر خوش نظر آیا۔

''کیوں صمد کیا بات ہے؟ آج تم خوشی سے پھولے نہیں سمار ہے''

''حضور مجھ پر خدا مہربان ہوا۔ میرے گھر ایک بیٹا پیدا ہوا۔ حضور میں باپ بن گیا ہوں''

میں نے اس کے مسرت سے بھرپور چہرے کو دیکھا۔ پھر سنجیدہ آواز میں کہا ۔ ۔

''صمد! کیا اُس کو بھی بھنگی بناؤ گے؟''

وہ زمین پر بیٹھ گیا۔

''نہیں بابو! وہ بھنگی نہیں بنے گا۔ وہ آپ کی طرح بہت بڑا آدمی بنے گا۔ میں اُس کو خوب پڑھاؤں گا''

مجھے خوشی ہوئی کہ آج ایک بھنگی کچھ اور بول رہا تھا۔ جس کو سماج صرف اندھیرے غاروں میں دیکھتا تھا۔

وقت کا دھارا بہتا گیا اور چھ سال یوں چلے گئے جیسے کبھی آئے ہی نہ تھے۔ میں اپنے بیٹے کو اسی محلے کے ایک اسکول میں داخل کرانے گیا جہاں صمد کا بیٹا پڑھ رہا تھا۔

''صمد کا لڑکا کس جماعت میں پڑھ رہا ہے؟''

''کس صمد کا لڑکا؟''

''صمد بھنگی کا لڑکا''

''حضور بھنگی کا لڑکا صرف بھنگی ہی بن سکتا ہے۔ ایک سال پڑھا اور چھوڑ دیا''

استاد کی بات سن کر مجھے دلی صدمہ ہوا۔ مجھے محسوس ہوا کہ بھنگی کا لڑکا مر گیا۔

پھر بہت دنوں بعد مجھے صمد ملا۔ وہ بوڑھا ہو چلا تھا۔ اس کے ہاتھ میں وہی پرانا جھاڑو تھا۔ میں نے اُس سے پوچھا ۔ ۔

"صمد تمہارا لڑکا زندہ ہے؟"

زندہ ضرور ہے لیکن بابو میں اُس کو وہ نہیں بنا سکا جو بنانا چاہا"

مجھے اس سے ہمدردی تھی، جس کی کشتی کو باد مخالف نے اُلٹ کے رکھ دیا تھا۔ ایک دن میں نے اُس کو اور اُس کے چھوٹے بیٹے کو سڑک صاف کرتے ہوئے دیکھا۔ میں چاہتا تھا کہ صمد کے بوڑھے بازوؤں میں ایک بار پھر وہ قوت بھر دوں جو اس کو سماج سے بغاوت کرنا سکھا دے۔

وقت کس کے ساتھ کیا سلوک کرتا ہے کسی کو یہ سب جاننے کے لئے فرصت نہیں ہوتی۔ سب اپنی دھن میں کھوئے رہتے ہیں۔ وہ اور اس کا بیٹا سڑکوں کو صاف کرتے رہے۔ موٹر، بسیں، ٹانگے سبھی سڑکوں پر چلتے رہے اور اس کے ساتھ باپ بیٹے کا جھاڑو بھی سڑکوں پر چلتا رہا۔

پھر ۔ ۔ پھر ایک دن ۔ ۔ صمد کا بیٹا لال چوک کی سڑک صاف کرتے ہوئے ایک موٹر کی زد میں آ گیا۔ معصوم بچے کا خون سڑک پر پھیل گیا۔ صمد بت کی طرح کھڑا رہا۔ وہ صرف اتنا کہہ سکا ۔ ۔ ۔

"میں اس کو وہ نہ بنا سکا جو وہ بننا چاہتا تھا، اس لئے خدا نے اس کو واپس بلا لیا"

دوسرے دن میں نے صمد کو سڑک پر اپنے ہی بیٹے کے خون کے دھبوں کو صاف کرتے ہوئے دیکھا ۔ ۔ کیونکہ ۔ ۔ وہ ۔ ۔ بھنگی تھا۔



تجزیہ نگار : جاوید انور

بھنگی

تجزیہ

''بھنگی'' کا عنوان ہمارے ذہن کو بے ساختہ کرشن چندر کے مشہور افسانہ'' کالو بھنگی'' کی جانب لے جاتا ہے۔ یہ بھی گمان گزرتا ہے کہ جن افسانہ نگاروں نے بعد میں اس کردار کو ذہن میں رکھ کر افسانے لکھے ہوں گے، ان کے تخلیقی ذہن پر یقیناً '' کالو بھنگی'' کا کچھ نہ کچھ پرتو رہا ہوگا کیوں کہ بھنگی کے کردار پر سب سے پہلے کم از کم اردو میں قلم اٹھانے والے افسانہ نگار کا نام کرشن چندر ہے۔ لیکن جب ہم وحشی سعید کے افسانے'' بھنگی'' کا مطالعہ کرتے ہیں تو مسرت ہوتی ہے کہ انہوں نے کرشن چندر سے ایک قدم آگے جاتے ہوئے ایک بہترین افسانہ تخلیق کیا ہے۔ ایک قدم آگے جانے کا مطلب یہ ہے کہ کرشن چندر نے کالو بھنگی کے کردار کو حاضر راوی کے صیغے میں پیش کرتے ہوئے اس کے کردار اور اس کے عمل کا جو بیان کیا ہے، ان میں کہیں کہیں خود حاضر راوی کا کردار مرکزی حیثیت حاصل کر گیا ہے اور اس طرح مرکزی کردار یعنی کالو بھنگی پس پشت جاتا محسوس ہوتا ہے۔

وحشی سعید نے بھنگی کے مرکزی کردار کے مرکزی عمل یعنی اس کے ذریعہ معاش کے پس منظر میں اس کی ازدواجی زندگی اور اس میں پلتی بڑھتی خواہشوں کی حصول یابی اور عدم حصول اور اس کے اسباب میں زمانے کے کردار و ذہنیت کی آئینہ داری کی ہے۔ پورے افسانے میں کہیں بھی راوی مرکز میں نہیں آتا بلکہ اس کی حیثیت ایک بیان کرنے والے کی ہی رہتی ہے۔ اس افسانے کا اختتام اس قدر دردناک جملے پر ہوتا ہے کہ افسانہ پڑھتے وقت قاری اپنے ذہن میں جو بھی خاکہ مرتب کرتا ہے، وہ تمام حیرت زدہ رہ جاتے ہیں کہ آدھے سے بھی زائد افسانے کے گہرے مطالعے کے باوجود کم از کم اس نتیجے تک تو نہیں پہنچا جا سکتا تھا۔ وحشی سعید نے بھنگی کے کردار کی تفہیم کے سلسلے میں اپنے خیالات کا اظہار افسانے کے پہلے ہی پیراگراف میں تمہیدی پیکر میں کر دیا ہے تا کہ قاری اور مرکزی کردار کے درمیان اس متعلق راوی کا کوئی شبہ یا مغالطہ ذہن نشیں نہ رہے۔ افسانہ اس طرح شروع ہوتا ہے۔

"بھنگی کا لفظ زبان پر آتا ہے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ ہونٹوں تک ایک گالی چلی آئی ہے۔ اگر میں نے اردو زبان کی لغات کو مرتب کیا ہوتا تو اس لفظ کو کبھی شامل نہ کرتا۔ لفظ کبھی برے نہیں ہوتے، دراصل یہ انسانی ذہن ہے جو لفظوں کو برا بناتا ہے۔ اور ان کو ایک ایسے ماحول کے سپرد کر دیتا ہے جہاں لفظوں کی اصلیت پر گندا لحاف چڑھ جاتا ہے۔ جب بھی میں لال چوک کی سڑک سے ٹانگے پر سوار گھر کی طرف جاتا تو کسی نہ کسی بھنگی کو سڑک صاف کرتے ہوئے دیکھتا۔ ایسے لمحات پر اکثر آدمیوں کے منہ لٹک جاتے۔ تب میرا دل چیخنے لگتا اور میں خود سے کہتا۔ "اٹھو اور لفظوں کا گندہ لحاف اتار کر پھینک دو"

افسانہ نگار نے کس قدر فنکاری سے فلسفیانہ انداز میں جہاں بھنگی کے لفظ اور اس کے کام کے تئیں سماج کے نظریہ کو پیش کیا ہے، وہیں اپنے حسیاتی نقطے کو کام میں لاتے ہوئے اس

روئے پر طنز بھی کیا ہے۔ بھنگی کے بارے میں لکھتے ہیں۔

''وہ شروع سے آخر تک بھنگی تھا۔ صمد ۔ ۔ نہیں ۔ ۔ صمد بھنگی ۔ ۔ صمد بھنگی سے سرینگر کے ہر گلی کوچے واقف تھے۔ ہر سڑک کی اس نے گندگی اٹھائی تھی۔ گندگی اور صاف کوچے اور گلیاں صمد کو نہیں بھول سکتے۔ ایسا کون تھا جو صمد کو نہیں جانتا تھا۔ اس کا پیشہ ہی ایسا تھا۔ وہ شرافت کا ایک پیکر مجسم تھا ۔ ۔ وہ انسان تھا۔ لیکن ۔ ۔ ایک بھنگی تھا۔ اس لئے کبھی کسی نے اس کے انسان ہونے کا ذکر نہیں کیا''

آخر کے دو جملوں کہ ۔ ۔

''وہ شرافت کا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس کے انسان ہونے کا ذکر نہیں کیا''

بھنگی کے کردار کو کوزے میں ساگر سمانے کی مانند ہے لیکن ابھی تک افسانے کا اصل واقعہ پیش نہیں کیا گیا ہے۔ قاری کا ذہن کام کرتا ہے کہ صمد کی پریشان حال زندگی کے کسی واقعے تک پہنچ کر افسانہ ختم ہو جائے گا لیکن وحشی سعید نے حیرت انگیز طور پر یہاں سے افسانے کا رخ موڑا ہے۔ یہ صمد زندگی سے پریشان اور اکیلا نہیں ہے بلکہ شادی شدہ، اپنی زندگی سے خوش، اپنی ذمہ داریوں کو سمجھنے والا اور خود میں مگن رہنے والا شخص ہے۔ وہ مفلس ہے جیسا کہ بھنگی ہوتا ہے یا ہوسکتا ہے لیکن مفلوق الحال نہیں، ہاں اسے جو غم ہے، وہ کسی بھی امیر سے امیر ترین شخص کو ہوسکتا ہے اور وہ ہے اولاد سے محرومی۔ لیکن اس کی یہ امید بھی بر آتی ہے۔ تو اب تو اسے انسان ہونے کا حق و اختیار مل جانا چاہئے۔ لیکن یہاں وحشی سعید نے دوسرا نقطہ ابھارا ہے کہ بچے تو جانور بھی پیدا کر لیتے ہیں۔ تو کیا مفلس زندگی جینے والے اور سماج کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر نہ چل سکنے والے حیوان کی مانند ہیں۔؟ یہ باریک سوال بھی وحشی سعید کے اس افسانے کے بطن سے پھوٹتا ہے اور اس خیال کو تقویت افسانے کے آگے کے جملوں سے ملتی ہے۔

''نہیں بابو، وہ بھنگی نہیں بنے گا۔ وہ آپ کی طرح بہت بڑا آدمی بنے گا۔ میں اس کو خوب پڑھاؤں گا''

''میں اپنے بیٹے کو اسی محلے کے ایک اسکول میں داخل کرانے گیا، جہاں صمد کا بیٹا پڑھ رہا تھا''

''صمد کا لڑکا کس جماعت میں پڑھ رہا ہے''

''کس صمد کا لڑکا''

''صمد بھنگی کا لڑکا''

''حضور بھنگی کا لڑکا صرف بھنگی ہی بن سکتا ہے۔ ایک سال پڑھا اور چھوڑ دیا''

ظاہر ہے کہ جس اسکول میں بڑے بڑے امیر ترین افراد کے بچے تعلیم حاصل کرتے ہوں، وہاں ایک مفلس اس کا خرچ کس طرح اٹھا سکتا ہے۔ جوش جنون میں اس نے داخلہ تو کرا دیا لیکن ایک سال کے اخراجات نے ہی ظاہر ہے اس کے حوصلے پست کر دئے ہوں گے، لیکن تعلیم سے دوری انسان کے لئے موت کی علامت ہے۔ اس حقیقت کو راوی نے فطری طور پر یوں برتا ہے۔

''صمد تمہارا لڑکا زندہ ہے''

''زندہ ضرور ہے بابو لیکن میں اس کو وہ نہ بنا سکا جو بنانا چاہا''

کیا تعلیم کے بغیر بھی انسان زندہ انسان کہلانے کا مستحق ہے،؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جس کے جواب کو اوران کے اندر سے ابھرتے مزید سوالوں پر گفتگو کے لئے دفتر درکار ہیں۔ دو جملوں میں افسانہ نگار نے بھنگی کی نسلوں کے مستقبل کی حقیقی آئینہ داری کر دی۔ وہ جملے یہ ہیں ۔ ۔ ۔

''وہ اور اس کا بیٹا سڑکوں کو صاف کرتے رہے۔موٹر، بسیں، ٹانگے۔سبھی سڑکوں پر چلتے رہے اور اس کے ساتھ باپ اور بیٹے کا جھاڑو بھی سڑکوں پر چلتا رہا''

یہاں غور طلب نقطہ یہ ہے کہ صمد اور اس کے بیٹے کے جھاڑو کے ساتھ موٹر یعنی امیر افراد اور بسیں، ٹانگے یعنی متوسط اور مفلس طبقوں کے افراد کے ساتھ مماثلت کے پس پشت افسانہ نگار کا مقصد کیا ہے؟ اس سوال کے بہت سے جواب ہو سکتے ہیں جو قارئین کی اپنی اپنی ذہانت کے مطابق ہوں گے۔اس کے بعد سے آخر تک کے جملوں میں افسانہ نگار نے اپنی تخلیقی ذہانت کا ثبوت دیتے ہوئے افسانے کو فنی عروج تک پہنچا دیا ہے۔کلائمکس در کلائمکس والے اس افسانے کے آخری اور سب سے زبردست کلائمکس کی ابتداء یوں ہوتی ہے۔

''پھر ۔ ۔ پھر ایک دن ۔ ۔ ۔ صمد کا بیٹا لال چوک کی سڑک صاف کرتے ہوئے ایک موٹر کی زد میں آ گیا۔معصوم بچے کا خون سڑک پر پھیل گیا۔صمد بت کی طرح کھڑا رہا۔وہ صرف اتنا کہہ سکا ۔ ۔ ۔

''میں اس کو وہ نہ بنا سکا جو بنانا چاہتا تھا، اس لئے خدا نے اس کو واپس بلا لیا''

یہاں بھی کئی باتیں غور طلب ہیں۔پہلی یہ کہ صمد کا لڑکا موٹر ہی کے نیچے کیوں آیا؟ کسی بس یا ٹانگے کے نیچے کیوں نہیں؟ اس ایک جملے میں بھی مفلسی اور امیری کے درمیان کا ذہنی بعد امیری کی لاپرواہی، یا عدم توجہی، اس قسم کے دوسرے کئی خیالات ذہن میں ابھرتے ہیں۔پھر صمد کا وہ جملہ نہایت درد انگیز اور آہ و بقا سے پر ہے۔اس میں بھی افسانہ نگار نے نقطہ در نقطہ پیدا کیا ہے۔صمد اپنے بچے کو وہ کیوں نہ بنا سکا جو بنانا چاہتا تھا، اس کے اسباب ظاہر ہیں لیکن اس کا یہ تصور کہ اسی لئے خدا نے اسے واپس بلا لیا، والدین کے اپنے لخت جگر کی مناسب تعلیم و تربیت نہ کرنے کی جانب بھی اشارہ ہیں۔وجہ چاہے کوئی بھی ہو، اسباب چاہے کوئی بھی ہوں، مجبوری ،مفلسی، سماج کی عدم توجہی یا سرکاری اسکولوں کا اس معیار کا نہ ہونا جس کے سبب ایک بڑا طبقہ مہنگے

اسکولوں کی جانب رخ کرتا ہے، وہ سب شامل ہو جاتے ہیں لیکن حاصل کلام یہ کہ خدا کے فرمان کے مطابق بھی کہ اپنی اولاد کو اچھی تعلیم و تربیت دلانا والدین پر فرض ہے، صمد اس فرض کی ادئے گی میں ناکام رہا، چاہے اس کا ذمہ دار کوئی بھی ہو۔ افسانہ ان جملوں کے ساتھ ختم ہوتا ہے۔

''دوسرے دن میں نے صمد کو سڑک پر اپنے ہی بیٹے کے خون کے دھبوں کو صاف کرتے ہوئے دیکھا ۔ ۔ کیوں کہ ۔ ۔ وہ ۔ ۔ ۔ بھنگی تھا''

اس ایک جملے میں انسانی کرب اور اذیت کی ایک دنیا آباد ہے۔ پہلی بات تو یہ کہ اپنے بیٹے کے خون کے دھبوں کو صمد نے اسی دن صاف کیوں نہیں کیا، دوسرے دن کیوں؟ ان دو لفظوں ''دوسرے دن'' کے اندر بھی ایک کہانی آباد ہے کہ پولیس آئی ہوگی، جہاں جہاں خون کے دھبے ہوں گے، اس جگہ کو حصار میں لیا ہوگا، تفتیش کو مکمل کرنے میں ایک دن کا وقت لگ گیا ہوگا۔ اور چونکہ صمد ہی اپنے بیٹے کے حادثے کا چشم دید تھا، اس لئے سارا دن اپنے بچے کے خون کے دھبوں کا مسلسل نظارہ کرنا ایک باپ کے لئے کس قدر اذیت ناک ہوسکتا ہے، جبکہ بیٹا اکلوتا ہو اور بڑی منت مرادوں سے اس کا جنم ہوا ہو۔ اس کے بعد چونکہ وہ ہی اس علاقے کا بھنگی ہے، اس لئے دوسرے دن اسے ہی اپنے بیٹے کے سوکھے ہوئے خون کے دھبوں کو صاف کرنا جس کے لئے زیادہ محنت درکار ہے کہ سوکھا خون چھوٹنے میں زیادہ وقت اور محنت لگتی ہے، ایک باپ کے لئے کس قدر اذیت ناک ہے۔ اس ایک مختصر افسانے میں وحشی سعید نے مختلف ڈائمنشنس کے تحت جتنے جہان معنی آباد کئے ہیں، وہ ان کی قادرالکلامی اور فن افسانہ نگاری پر ان کی دسترس کے ضامن ہیں۔



سزا ۔ ۔ کس جرم کی؟

انیس سال کا سکندر زندگی کی سنجیدگیوں سے بے نیاز تھا۔ یہی وجہ تھی کہ بڑی مشکلوں سے وہ میٹرک کا امتحان پاس کر سکا۔ دوستوں کے ساتھ ایودھیا کی مست ہواؤں میں مدہوش رہتا تھا۔ اس کے والد فرقان اس کی شرارتوں سے نالاں تھے لیکن اکلوتی اولاد ہونے کے سبب فرقان کی والدہ اس کی ہر شرارت پر اپنے بیٹے کا ہی ساتھ دیتی۔

وہ اس دن کی بات تھی جب سورج سوا نیزے پر تھا، ایودھیا شہر اندھیرے میں ڈوب گیا۔ بابری مسجد شہید ہوگئی اور رام کا ایودھیا انسانی خون سے لالہ زار ہو گیا۔ یہ وہی ایودھیا تھا جہاں مہاراجہ دشرتھ کی ایک زبان پر انکا سب سے پیارا اور سب سے لائق بیٹا جو بالکل بے گناہ ہوتے ہوئے بھی چودہ برس کے لئے جلاوطن ہوگیا۔

اس دن خون کا منظر دیکھ کر سکندر پر لرزہ طاری ہو گیا۔ اس نے اپنے معمولی گھر میں پناہ لی۔ اس کا والد سیٹھ رام اوتار کی فیکٹری میں ساڑی چھپائی کا کام کرتا تھا اور اپنی قابلیت، محنت اور ایمانداری کے سبب فیکٹری کے تمام مزدوروں میں بہت مقبول تھا اور سبھی اس کا احترام کرتے تھے۔ اس دن سیٹھ اوتار سنگھ نے فیکٹری کا دروازہ بند کرتے ہوئے کہا ۔ ۔ ۔

”کچھ دنوں کے لئے فیکٹری مت آنا“

فرقان ہکا بکا رہ گیا۔ وہ جب گھر پہنچا تو بیوی اور بچے کو بہت خوف زدہ پایا اور انہیں تسلی

دیتے ہوئے یہ بھی نہ بتا سکا کہ اب وہ کچھ دنوں کے لئے ہی سہی لیکن بیروزگار ہو چکا ہے۔اس رات سارا شہر آنسوؤں کی آہ و بقا میں ڈوبا ہوا تھا۔تینوں کی آنکھوں سے نیند غائب تھی ،فرقان کو اپنے بھائی عنایت کی یاد آئی جو اس سے اکثر کہا کرتا تھا ۔ ۔ ۔

''بھائی ممبئی چلے آؤ۔ یہاں تمہاری محنت کی اتنی قدر نہیں ہے جتنی ہونی چاہئے۔یہاں تم جتنا کماتے ہو اُس سے چار گنا زیادہ کماؤ گے۔ایسی جادو نگری ہے ممبئی''

''میں یہاں جتنا کماتا ہوں اپنے گھر میں کماتا ہوں، جہاں میری پیدائش ہوئی ہے ۔مجھے یہیں کی مٹی میں دفن ہونا ہے۔ایودھیا کی سرزمین ہی میرے لئے جادو نگری ہے''

''اے جی ،اب کیا ہوگا؟''

اس کی بیوی کی آواز نے اس کے خیال کو منتشر کیا۔

''رات ہی میں سارے ضروری سامان باندھ لو ہم صبح تڑکے ہی ممبئی کے لئے روانہ ہو جائیں گے''

سورج نکلنے میں ابھی کافی وقت تھا لیکن ریلوے اسٹیشن پر میلے کی طرح بھیڑ تھی وہاں موجود ہر کوئی جلد از جلد ایودھیا چھوڑ دینا چاہتا تھا۔فرقان کی آنکھوں سے چند قطرے ٹپک پڑے جو اس نے اپنے رومال میں جذب کر لئے۔

دادر اسٹیشن پر اس کا بھائی استقبال کے لئے منتظر تھا۔ٹیکسی سے اس نے باہر کا نظارہ دیکھا۔اونچی اونچی عمارتیں آسمان کو چھو رہی تھیں۔لیکن جب وہ ایک چال میں پہنچے تو اسے وہ تمام عمارتیں بے معنی لگیں۔کئی دنوں تک وہ عنایت کی کھولی میں ہی رہا گھر سے باہر نہیں نکلا،اس کی

بیوی نے کہا ۔ ۔

''جینا ہے تو کچھ کام دھام کرنا پڑیگا۔کب تک اپنے بھائی پر بوجھ بنے رہو گے۔ایودھیا چھوٹ گیا تو کیا،ہم یہاں بھی خوش رہ سکتے ہیں''

''کیا ہم ایودھیا چھوڑ کر کہیں بھی خوش رہ سکتے ہیں؟''

اس کی بیوی خاموش ہوگئی۔اس دن شام کو اس نے اپنے بھائی عنایت سے کہا۔

''بھائی،کل میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گا کہیں کوئی کام دلوا دینا''

''بھائی یہاں تم جیسے محنتی اور ایماندار لوگوں کے لئے کام اور اچھی زندگی کی کوئی کمی نہیں ہے۔میرے سیٹھ ہیروں کے بڑے کاروباری ہیں۔بہت بھلے آدمی ہیں۔میری محنت اور ایمانداری سے بہت خوش بھی رہتے ہیں۔امید ہے وہاں آپ کو بھی کام مل جائے گا''

فرقان کو اپنا سیٹھ رام اوتار یاد آ گیا۔

صبح ہوتے ہی دونوں چرچ گیٹ کے لئے روانہ ہو گئے۔

'یہاں چرچ کہاں ہے؟'اور اس کا گیٹ ۔ ۔ ۔

''بھائی یہاں چرچ نہیں ہے،نہ ہی اس کا گیٹ ہے۔یہ تو اس جگہ کا نام ہے''

عنایت اس سوال سے تھوڑے سے سٹپٹا سے گئے۔وہاں سے وہ انڈیا گیٹ گئے۔وہاں عنایت نے اس کی تاریخ بتائی۔'انگریزوں کے راج اور ہماری غلامی کی نشانی' سامنے تاج ہوٹل تھا۔عنایت نے صرف یہ بتایا کہ اسے ٹاٹا نے بنایا ہے جو دنیا کے بہترین ہوٹلوں میں شمار ہوتا ہے۔راستے میں دوسرے کئی مقامات اور اونچی اونچی عمارتیں دیکھتے ہوئے وہ گھر واپس آئے۔

''بھائی آپ کو ممبئی شہر پسند آیا؟''

''ہاں لیکن اپنا ایودھیا۔۔۔''

دوسرے دن کچھ وقت پہلے ہی عنایت اسے لیکر اپنے دفتر آ گیا تھا اور اپنے کام میں لگ گیا تھا۔ دھرمندر سیٹھ بھی آج جلدی آ گئے۔ اسے کام کرتے دیکھ کر مسکراتے ہوئے اس کے پاس آئے۔

''کیوں بہادر، کل جو مال بھجوانا تھا۔۔۔''

''وہ کل شام کو ہی چلا گیا سیٹھ جی، کل ہی ان سے چیک وصول کر کے منیم جی کو دے بھی دیا۔ ان کے دوسرے آرڈر کا خاکہ بھی بن گیا ہے۔ ملازم آ جائیں تو کام شروع کروادوں''

''گڈ۔ تم جلد ہی ترقی کرو گے میری نظر تم پر ہے۔ یہ کون۔۔''

''سر، یہ میرے بھائی ہیں۔ بہت محنتی اور ایماندار۔ ایودھیا سے آئے ہیں، وہ۔۔''

'اچھا اچھا۔ تمہارے بھائی ہیں تو تمہاری طرح محنتی تو ہوں گے ہی''

''نہیں سر، میں ان کے جیسا محنتی اور ایماندار بننے کی کوشش کرتا رہتا ہوں''

''تو پھر انہیں منیجر سے ملوادو، اور ان کے لائق جو کام ہو''

''بہت بہت شکریہ سیٹھ جی''

سیٹھ جی کا جملہ پورا ہونے سے پہلے ہی اس نے ہاتھ جوڑ دئے۔ زندگی اب معمول پر آنے لگی تھی۔ سکندر بھی اپنے چاچا کے بیٹے رفاقت کا دوست بن گیا تھا۔ وجہ یہ کہ دونوں کی عمر میں بہت کم فرق تھا۔ رفاقت پڑھنے میں بہت تیز تھا ہمیشہ کلاس میں اول آتا تھا۔ اس کا اثر سکندر کی پڑھائی پر بھی پڑا تھا۔ وہ بھی پہلے سے بہتر ہو گیا تھا لیکن فرقان اور اس کی بیوی کے دل کو ایودھیا کی یاد منتشر کئے رہتی۔ وقت گزرتا رہا۔ ایک دن فرقان نے رفاقت سے کہا۔

''میں نے ارادہ کیا ہے کہ ایودھیا جاؤں''

''لیکن بھائی، وہاں کے حالات ۔ ۔ اور پھر یہاں آپ کا کام بھی اچھا چل رہا ہے۔ترقی کا بھی موقع ہے۔سیٹھ آپ سے بہت خوش ہے۔پھر ۔ ۔ ''

''ارے یار میں ہمیشہ کے لئے تھوڑی جانے کو کہہ رہا ہوں۔دراصل ان حالات میں وہاں سے آنا ہوا کہ مجھے وہاں کے اپنے ملنے جلنے والوں،رشتہ داروں،دوست و احباب،اپنے سیٹھ،اس کی فیکٹری سب کی فکر لگی ہوئی ہے۔ایک بار جا کر وہاں سب لوگوں کو ٹھیک ٹھاک،سلامت دیکھ لوں،پھر تو یہیں رہنا ہے اب ۔ ۔ ''

''یہ اچھی بات ہے۔تو پھر آج ہی سیٹھ کو چھٹی کی عرضی دے دو گے تو ایک ہفتہ بعد چھٹی مل جائے گی۔پھر کیا ایودھیا خالی ہاتھ جاؤ گے۔جانے کے ایک دن پہلے وہاں کے دوستوں،رشتہ داروں کے لئے کچھ خریداری بھی کر لینا''

کل کی ٹرین سے ایودھیا جانا تھا،اس لئے آج فرقان،عنایت ان دونوں کی بیویاں اور عنایت کی بیٹی زویری بازار میں خریداری کر رہے تھے۔سکندر اور رفاقت گھر پر تھے۔رفاقت نے کہا۔

''بھائی آپ یہاں آ گئے تو مجھے بڑا سہارا مل گیا۔میں بہت خوش ہوں۔اب مجھے چھوڑ کر تو نہیں جاؤ گے نا''

''نہیں یار۔بھلا بھائی بھی بھائی کو چھوڑ کر کہیں جاتا ہے۔جاتی تو بہنیں ہیں،وہ بھی شادی کے بعد۔ہمیں تو یہیں رہنا ہے،ساتھ ساتھ۔ایودھیا میں تو میرا پڑھائی میں دل ہی نہیں لگتا تھا۔اب یہاں تو لگتا ہے کہ اگر تم ڈاکٹر بن گئے تو میں کم سے کم تمہارا کمپاؤنڈر تو بن ہی جاؤں گا''

اس کا جملہ پورا ہوتے ہی دونوں زور زور سے ہنسنے لگے۔

زویری بازار گاہکوں سے بھرا ہوا تھا۔ وہ سب کپڑے کی دوکان پر تھے۔ فرقان اپنے مالک رام اوتار کے لئے شال اور ٹوپی پسند کر رہا تھا۔ باقی لوگ بھی دوسرے کپڑوں کو پسند کر رہے تھے کہ ایک زوردار دھماکہ ہوا۔ عنایت نے فرقان، اس کی بیوی اور اپنی بیٹی کو گرتے دیکھا، پھر اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ فرقان نے آخری سانس لیتے ہوئے عنایت کی بیوی کو زمین پر پڑے دیکھا اور پھر ۔ ۔ ۔

چال کا پہریدار گلی میں سب سے کہہ رہا تھا۔

''زویری بازار میں بہت بڑا بم پھٹا ہے۔ کئی لوگ مارے گئے ہیں، بہت سے زخمی ہیں۔ ممبئی کے دوسرے علاقوں میں بھی ایسے کئی دھماکے ہوئے ہیں۔ ہر جگہ سے لوگوں کے مرنے کی اور زخمی ہونے کی خبریں آ رہی ہیں''

''زویری بازار ۔ ۔ وہاں تو ہمارے امی ابا خریداری کرنے گئے ہیں۔ اور اب تک تو انہیں آ بھی جانا چاہئے تھا''

''کیا۔؟ گھبراؤ نہیں بچوں، میں ابھی تمہارے ساتھ زویری بازار چلتا ہوں''

زویری بازار کو چاروں جانب سے پولیس نے حصار میں لے رکھا تھا۔ تینوں کو ایک حولدار نے روک لیا ۔ ۔ ۔

''کہاں جا رہے ہو''

دونوں نے روتے ہوئے کہا ۔ ۔ ۔ ''ہمارے ماں باپ ۔ ۔ ''

''اچھا، اچھا۔ بچو یہاں سے سارے لوگوں کو ممبئی اسپتال لے جایا گیا ہے۔ آپ لوگ وہاں جائیے''

جب زخمیوں کے درمیان ان کو اپنے گھر والے نہ ملے تو انہوں نے مردہ گھر کی جانب رخ کیا۔ ایک ساتھ پانچ لاشیں دیکھنے کی تاب چال میں کسی کو بھی نہ تھی۔ چال کی ہر آنکھ نے

روتے ہوئے ان کی آخری رسومات انجام دیں۔ سپرد خاک کرنے کے بعد سب نے یہی کہا کہ وہ خود کو یتیم نہ سمجھیں، چال کے لوگ ان کے اپنے ہیں۔ رات میں روتے روتے رفاقت سو گیا، لیکن سکندر کی آنکھوں سے نیند کوسوں دور تھی۔ اس کا ذہن آنے والے مستقبل کا خاکہ تیار کر رہا تھا۔ صبح چال والوں کی دوبارہ ہر طرح کی تسلی کے باوجود کہ وہ دونوں خود کو یتیم نہ سمجھیں، جب تک وہ پڑھ لکھ کر کچھ قابل نہیں ہو جاتے، ان کا کھانا پینا غرض سارا خرچ چال والے مل کر اٹھائیں گے، سکندر نے خود کو یتیم ہی سمجھا۔ اب اس کے لئے پڑھائی جاری رکھنا ممکن نہ تھا، لیکن بھائی کو ہر حال میں اونچے سے اونچا مقام دلانا تھا۔ دس بجے وہ اپنے والد کے سیٹھ دھرمندر کے پاس تھا۔

'بیٹا مجھے بہت افسوس ہے، بتاؤ میں تمہارے لئے کیا کر سکتا ہوں۔ تم چاہو تو میں تم دونوں کے لئے ماہانہ کچھ رقم مقرر کر دیتا ہوں، جس سے تمہاری پڑھائی لکھائی اور کھانے پینے میں کافی حد تک سہولت ہو جائے گی۔ تمہارے باپ اور چاچا اس کمپنی کے دو مضبوط ہاتھ تھے۔ ان کی ایمانداری اور محنت۔۔۔ یہ کہتے کہتے سیٹھ کی آنکھیں بھی نم ہو گئیں۔

'سیٹھ جی، زندگی کے حالات بدل گئے ہیں۔ اب تو ایک ہی مقصد باقی رہ گیا ہے۔ اپنے بھائی کو پڑھا لکھا کر بڑا آدمی بنانا۔ میں آپ سے یہ التجا کرنے آیا ہوں کہ آپ مجھے کوئی ایسا کام دیں جو میرے باپ اور چاچا دونوں کی تنخواہ کے برابر ہو۔ بھلے مجھے روز دوگنا کام کیوں نہ کرنا پڑے۔ مجھے اپنے بھائی کو اچھے سے اچھا ماحول اور اچھی سے اچھی زندگی دینی ہے۔'

سیٹھ دھرمندر اس کی باتوں کو سن کر حیرت زدہ رہ گیا۔ اتنے میں چائے آ گئی۔ دونوں چائے پینے لگے۔ سیٹھ کی نظر برابر سکندر کے چہرے کے تاثرات پڑھ رہی تھی۔ چائے ختم ہونے پر سیٹھ نے منیجر کو بلایا۔

'سکندر کو ہیروں کی فیکٹری میں ان کی جانچ پرکھ ہیرے تراشنے اور اس کی ڈیزائن بنانے کا کام سیکھنے پر لگا دو۔ اور سکندر تم لگن سے ہیرے کے متعلق ہر باریکی کو سیکھو۔ میرے خیال میں اگر کڑی محنت کرو گے تو تین چار ماہ میں کچھ نہ کچھ سیکھ لو گے، اپنی تنخواہ کی فکر نہ کرو۔ تمہاری دوگنی تنخواہ تمہیں

ہر مہینے ملتی رہے گی۔

سکندر کا جنون سیٹھ کی قیاس آرائی سے بھی بہت آگے نکلا۔ وہ اپنے والد اور چاچا کی طرح ہنس مکھ اور ملنسار نہ تھا۔ کسی نے بھی اس کی زبان سے ہوں ہاں کے علاوہ دوسری کوئی بات نہیں سنی۔ سب نے ہمیشہ اسے کام کرتے ہوئے ہی پایا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس نے تین مہینے کا کام ایک مہینے میں اور ایک سال کا کام چار مہینے میں سیکھ لیا۔ ایک سال گزرا تھا کہ اس کا شمار ہیرے کے ماہرین میں ہونے لگا۔

رفاقت آشیانہ بلڈنگ کی بارہویں منزل پر واقع اپنے فلیٹ سے سامنے کی چال کو دیکھ رہا تھا کہ سکندر نے کہا۔

'کیا بات ہے یار۔ بڑی حسرت سے سامنے دیکھ رہے ہو۔؟'

'دیکھ رہا ہوں بھائی، وہ چال جہاں ایک عرصہ گزارا۔ اور اب یہ بہترین فلیٹ۔ آج چال کو دیکھ کر پتہ نہیں کیوں یہ خیال آیا کہ واپس چال میں جا کر رہوں۔ آپ کو کبھی یہ خیال نہیں آیا۔'

'مجھے تو ہر روز یہ خیال آتا ہے کہ ممبئی ہی چھوڑ کر ایودھیا چلا جاؤں۔ لیکن تمہارا مستقبل۔۔۔۔'

'آپ ایودھیا کو اب تک نہیں بھولے'

'ایودھیا میری روح ہے رفاقت۔ جس ڈر سے ہم ایودھیا چھوڑ کر بھاگے تھے، وہ حادثہ تو یہاں بھی ہو گیا۔ میں سوچتا ہوں کہ اگر ابا ایودھیا چھوڑ کر نہ آئے ہوتے تو شاید ہمارے تمہارے سب کے گھر والے زندہ ہوتے۔'

'لیکن وہاں تو بہت خطرہ تھا۔'

'جہاں خطرہ ہوتا ہے وہاں تحفظ کی راہیں بھی ہوتی ہیں۔ اب میں سمجھتا ہوں کہ ہمیں وہیں رہ کر حالات کا سامنا کرنا تھا۔ سب اپنے ہی تو تھے۔ وہ تو حالات کی ستم ظریفی تھی۔ لیکن کچھ دنوں میں سب ٹھیک ہو گیا

'آپ نے کہا تھا کہ میرا ساتھ نہ چھوڑو گے'

'اسی لئے تو۔ ورنہ ابا کہا کرتے تھے کہ موت کا ایک دن مقرر ہے۔ اور جب مرنا ہی ہے تو کیوں نہ اپنی مٹی جہاں جنم لیا ہے، وہیں دفن ہوا جائے۔ ابا شاید خوف میں اپنی ہی کہی ہوئی یہ بات بھول گئے تھے۔۔۔

خیرات بہت ہوگئی ہے۔ تمہیں کل کالج جانا ہے اور مجھے بھی کل سیٹھ جی نے جلدی بلایا ہے۔'

'کیوں۔؟

'پتہ نہیں یار۔ کوئی اہم کام ہوگا۔ ممکن ہے کچھ تنخواہ بھی بڑھ جائے۔'

یعنی ترقی۔ مبارک ہو بھائی۔'

'سکندر، جیسا کہ تمہیں علم ہے کہ کچھ مغالطے کے سبب میں نے اور میرے بھائی پارس نے اپنے خاندانی کاروبار کے دو حصے کر لئے تھے۔ اب ہم بھائیوں کے درمیان کی دوریاں مٹ گئی ہیں اس لئے ہمارا کاروبار پھر ایک ہو گیا ہے۔ اور کاروبار ایک ہو جانے کے سبب ممبئی میں ہم سے بڑا ہیروں کا تاجر اب کوئی نہیں رہا۔ باہر کے ملکوں میں جو ہماری برانچز ہیں، اب ان کی طرف بھی زیادہ توجہ دینا ضروری ہے، اس لئے میں امریکہ جا رہا ہوں اور میرے بچے میں چاہتا ہوں کہ تم بلجیم والی برانچ سنبھالو۔ وہاں کا کام زیادہ کٹھن ہے۔ ہیروں کی پہچان، اس کی تراش خراش اور لین دین، نفع ونقصان کو تم اچھی طرح انجام دے سکتے ہو۔ میرے بچے میں تمہارے باپ اور چاچا کو اس سے بھی اونچے مقام پر دیکھنا چاہتا تھا جو کہ وہ یقیناً حاصل کرتے اگر زندہ ہوتے۔ ویسے یہ میری ایک تجویز ہے۔ اگر تم اپنے بھائی کو ساتھ لے جانا چاہو تو وہ بھی ٹھیک ہے۔ اور اگر اس کی محبت میں نہ جانا چاہو اور یہیں کام کرنا چاہو تو تم پر کوئی دباؤ نہیں۔ تم میرے بچے ہو۔ جیسی تمہاری مرضی۔' سکندر کچھ پل خاموش رہا، پھر بولا۔

'سیٹھ جی، آپ نے ہم یتیموں پر اتنی مہربانی کی ہے کہ۔۔ اگر کوئی نالائق بیٹا بھی ہوتا تو باپ کا نقصان نہیں سہہ سکتا تھا، پھر میں تو آپ کا لائق بیٹا ہوں۔ میں اپنے باپ کا مالی نقصان یا پھر کاروبار میں پریشانی کیسے برداشت کرسکتا ہوں۔ میں بلجیم جاؤں گا۔ رفاقت یہیں رہے گا۔ اسے

بھی تو زندگی میں تنہا اپنے بل پر کھڑا ہونے کا ہنر آنا چاہئے۔ حکم کیجئے، کب روانہ ہونا ہے۔'

'شاباش میرے بچے۔ پرسوں ہم دونوں باپ بیٹے ایک ساتھ ائرپورٹ نکلیں گے۔ اور اب تم کمپنی کے ملازم نہیں ہو بلکہ بلجیم کی برانچ کے منافع میں دس فی صد کے حصہ دار ہو۔' یہ کہہ کر سیٹھ دھرمندر نے اسے گلے سے لگالیا۔ واپس گھر آنے پر اس نے رفاقت کو بھی زندگی کے فلسفے اور تجربوں کی کئی کہانیاں سنا کر راضی کرلیا۔ بلجیم میں اس نے اپنے ہنر کا خوب مظاہرہ کیا۔ اس برانچ نے اس کی رہ نمائی میں کافی ترقی کی اور منافع کمایا۔ ایک دن پارس سیٹھ یکا یک بلجیم میں اس کی آنکھوں کے سامنے تھا۔

'ارے سیٹھ جی آپ'

'کہاں کا سیٹھ بے۔ جب تو میرے بڑے بھائی کو بابا کہتا ہے تو مجھے چاچا کہنے میں شرم آتی ہے، نالائق۔' یہ کہتے ہوئے سیٹھ پارس اس کے گلے لگ گیا۔ سکندر کو محسوس ہوا کہ جیسے اس کے چاچا عنایت نے اسے گلے سے لگالیا ہو۔ ادھر ادھر کی اور دوسری کاروباری باتوں کے بعد سیٹھ پارس مدعے پر آیا۔

'بیٹا۔ تم نے اخباروں میں پڑھا ہوگا کہ اس وقت افریقہ کے حالات بہت خراب ہیں۔ وہاں جو ہمارے تاجر بھائی ہیں، انہوں نے پیشکش کی ہے کہ اگر ہم ایک ساتھ ان کے تمام ہیرے خرید لیں اور نقد پیسہ ان کے نیویارک والے اکاؤنٹ میں جمع کردیں تو وہ اپنا سارا مال آدھی قیمت میں ہمیں دے دیں گے۔ تم نے یہاں اور بھائی صاحب نے امریکہ میں جو کاروباری ترقی کی ہے۔ اس کی بدولت ہم ان کا سارا مال نقدی میں خرید سکتے ہیں۔ لیکن چونکہ وہاں خون خرابہ، گولی باری، بم دھماکہ عام بات ہے، ہر وقت دہشت کا ماحول ہے، اس لئے ایک تو وہاں جانا خطرناک ہے، دوسرے ہیرے اصلی ہیں یا نقلی اس کی پہچان اور پھر اصلی ہیروں کو لیکر وہاں سے سیدھے نیویارک جانا اور درمیان میں اتنے سارے ہیروں کے پاس رہنے سے نیت کا نہ خراب ہونا، یہ سب اسی سے ہوسکتا ہے جو اپنا ہو، ایمانداری کا خون اس کی رگوں میں بہتا ہو اور بہادر بھی ہو۔ تم

نے جس طرح نامساعد حالات کا سامنا بہادری سے کیا ہے۔ باقی دونوں خصوصیات تو۔۔۔۔۔'

'کب نکلنا ہے چاچا جی' ۔ سیٹھ پارس کا جملہ پورا ہونے سے پہلے سکندر بول اٹھا۔

'شاباش میرے بہادر بھتیجے۔'

جب وہ سیرالیون کے ائرپورٹ پر اترا تو عجب ماحول تھا۔ وہاں سے ہوٹل تک دکانیں بند تھیں، ایک دو جگہ دھماکے اور گولی باری اور نعروں کی آواز بھی سنی گئی۔ سکندر نے من ہی من کہا۔ 'یہاں بھی ایودھیا اور ممبئی'۔

ہوٹل پہنچنے کے بعد اس نے تمام تاجروں کو بلایا۔ سب کے چہروں کا رنگ اڑا ہوا تھا۔ سودا طے ہو گیا۔ پروگرام یہ بنا کہ ائرپورٹ کے پاس والے ہوٹل جس کا دروازہ پیچھے گلی میں بھی کھلتا تھا، میں تمام تاجر اپنا مال لیکر اس کی اوپری منزل پر اکٹھا ہوں گے، وہیں ہیروں کی جانچ ہوگی۔ وقت مقرر پر سب حاضر تھے۔ سکندر نے سارا مال چیک کرنے کے بعد سیٹھ پارس کو فون کیا۔ آدھا گھنٹہ انتظار کے بعد تمام تاجروں کے نیویارک کے اکاؤنٹ میں پیسے جمع ہو گئے، تو سب نے ہیرے سکندر کے حوالے کر دئے۔ اس نے پانچ منٹ کے لئے تاجروں کو وہیں روکا اور سارے ہیرے اور اپنا سوٹ کیس لیکر باتھ روم میں چلا گیا۔ دروازہ اندر سے بند کرنے کے بعد اس نے سوٹ کیس سے بنا بانہ والی ایک چمڑے کی جیکٹ نکالی جس کے چاروں طرف چین لگی ہوئی مضبوط جیبیں تھیں۔ اس نے جلدی جلدی تمام جیبوں کو ہیروں سے بھر دیا اور اس کے اوپر شرٹ پہن لی پھر کوٹ اور اسکے اوپر سردی سے بچنے کے لئے اورکوٹ۔ پھر اس نے سوٹ کیس سے ایک چمڑے کے بیگ کو نکالا اور اس میں دوسرے کپڑے بھرے۔ سوٹ کیس میں اس نے صرف ڈالروں کی دو گڈیاں اور کچھ کاغذات رکھے اور باہر آ گیا۔ سارے تاجر اسے دیکھ رہے تھے۔ ایک نے مشورہ دیا۔

''آپ نے جو ہیرے سوٹ کیس میں رکھے ہیں تو میرا مشورہ ہے کہ پیچھے کی گلی سے ائرپورٹ جائیے۔ اگر مین روڈ پر پولیس نے بھی آپ کو چیک کیا تو سارے کاغذات ہونے کے باوجود وہ

آپ سے کم از کم آدھا مال لے لیں گے۔ اگر آپ پیچھے سے جائیں گے تو گلی سنسان ضرور ہے، لیکن آپ سیدھے ائر پورٹ پہنچ جائیں گے۔ ہمارے پاس چونکہ کچھ ہے نہیں، اس لئے ہمیں لٹنے کا کوئی خطرہ نہیں ہم سب مین سڑک سے نکل جائیں گے''

'میرے خیال میں گلی میں کوئی چور اچکا بدمعاش یا کوئی لٹیرا اگر مل گیا تو پورا مال بھی جائے گا اور جان بھی جاسکتی ہے۔ اس لئے مین سڑک سے جانا ہی ٹھیک رہے گا' دوسرے تاجر نے کہا۔

''آپ درست کہتے ہیں۔ آپ ہمارے ساتھ ہی ہوٹل سے مین سڑک تک نکلئے'۔۔ تیسرے تاجر نے کہا۔

'لیکن اس گلی میں ایسی کوئی واردات ادھر تو سننے میں نہیں آئی''۔۔ ایک اور تاجر نے کہا۔

''لیکن آگے بھی نہ ہوگی، اس کی گارنٹی کون لے سکتا ہے۔ آپ ہمارے ساتھ نکلئے۔ مین روڈ پر اگر پولس نے روکا بھی تو آپ ائر پورٹ جلدی پہنچنے کا بہانہ کر کے کچھ روپئے انکے سامنے رکھ دینا ممکن ہے وہ سوٹ کیس اور اس بیگ کی تلاشی نہ لیں''

مین سڑک پر آکر اس نے سب سے ہاتھ ملا کر ان کو رخصت کیا۔ منیجر نے ٹیکسی بلانے کے لئے کہا تو اس نے منع کر دیا اور تھوڑی ہی دور کھڑی پولیس کی ایک بڑی ٹاٹا سومو جیسی گاڑی کی جانب بڑھ گیا۔ وہاں پہنچ کر اس نے بڑے ہی خوف زدہ لہجے میں پولیس افسر اور اس کے پانچ ساتھیوں سے کہا۔ میں ہندوستانی ہوں۔ بلجیم سے یہاں کاروبار کے سلسلے میں آیا تھا، لیکن یہاں کے حالات نے مجھے دہشت زدہ کر دیا۔ جن کاروباریوں سے میں یہاں کاروبار کرنے آیا تھا، انہوں نے بھی منع کر دیا۔ ابھی ابھی وہ مجھے تنہا چھوڑ کر یہ کہتے ہوئے چلے گئے کہ بہت ہوشیاری سے ائر پورٹ جایئے گا۔ یہاں قدم قدم پر جان کا خطرہ ہے۔ میرے پاس کچھ روپئے اور کپڑوں سے بھرا بیگ ہے۔ آپ لوگ پولیس والے ہیں، مہربانی کر کے مجھے ائر پورٹ پہنچا دیجئے تا کہ میں نیویارک صحیح سلامت پہنچ جاؤں۔' یہ کہتے ہوئے اس نے کپڑوں سے بھرا بیگ الٹ دیا اپنی اوورکوٹ کی جیب سے ویزا اور ٹکٹ نکال کر دکھایا اور سوٹ کیس بھی کھول دیا جس میں ڈالر کی دو گڈیوں کے علاوہ کچھ

کاغذات تھے۔ پولیس والے اس کی بات سے ہکا بکا رہ گئے۔

کچھ لمحے بعد پولیس افسر نے خود کے حواس پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

'آپ ہمارے ملک میں ہمارے مہمان ہیں لیکن حالات تو آپ کے سامنے ہیں۔ ہمیں بھی پچھلے ماہ کی تنخواہ ابھی تک نہیں ملی۔ ہم اپنے بچوں کو کیا کھلائیں، کہاں سے کھلائیں۔ اس لئے اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو ہم ڈالروں کی ان دو گڈیوں میں سے ایک اپنے پاس رکھ لیں۔' یہ سنتے ہی سکندر نے جذباتی ہونے کی کامیاب اداکاری کرتے ہوئے فوراً ایک گڈی اس افسر کے ہاتھ میں رکھ دی اور غمگین لہجے میں بولا۔

'یہ میری طرف سے آپ کے بچوں کے لئے تحفہ ہے۔ آپ اپنے بینک اکاؤنٹس مجھے لکھوا دیں۔ میں نیویارک جا کر فوراً کچھ رقم آپ کے اکاؤنٹس میں ڈال دوں گا اور جب یہاں حالات ٹھیک ہو جائیں گے تو میں آؤں گا۔ آپ لوگ مجھ سے ضرور ملنا۔ اور اگر کبھی انڈیا، بلجیم یا نیویارک کا پروگرام بنے تو مجھے ضرور اطلاع دینا۔ آپ وہاں میرے مہمان ہونگے۔' ترکیب کام کر گئی سارے پولیس والے جذباتی ہو گئے۔ ایک اس کے کپڑوں کو بیگ میں بھرنے لگا، دوسرا اسے اکاؤنٹ نمبر لکھوانے لگا اور باقی اس طرح مستعد ہو گئے گویا کسی وزیر کو ائرپورٹ چھوڑنے جا رہے ہوں۔ افسر بہ حفاظت اسے ائرپورٹ کے اندر تک چھوڑنے آیا اور اسے گلے لگا کر رخصت کیا۔ نیویارک کے جان۔ ایف۔ کینیڈی ائرپورٹ پر سیٹھ دھرمندر نے اس کا والہانہ استقبال کیا اور گھر پہنچ کر تمام ہیروں کے منافع کا بیس فی صدی اسے دے دیا اب وہ نیویارک کی برانچ سے ہونے والے منافع کا بھی بیس فی صدی کا حصہ دار تھا۔ اس نے اپنے بھائی رفاقت کو فون کیا۔

'کیا بھائی، آپ اتنے سنگین حالات کے بعد بھی افریقہ چلے گئے اور مجھے بتایا تک نہیں۔'

'یار خراب حالات سب جگہ ایک ہی طرح کے ہوتے ہیں۔ چاہے وہ ایودھیا ہو، ممبئی ہو یا پھر سیرالیون۔ خیر میں بالکل ٹھیک ہوں۔ تم نے بھی اپنی پڑھائی پوری کر لی۔ ڈاکٹر بن گئے۔ مجھے بڑی خوشی ہے۔ اب میں سمجھتا ہوں ہمیں اپنی مٹی کا قرض ادا کرنے کا وقت آ گیا ہے۔ تم اپنا ایک

بڑا اسپتال بناؤ۔ پیسوں کی فکر نہ کرنا۔ جتنا بھی لگے۔ لیکن یہ اسپتال ممبئی میں نہیں ایودھیا میں کھولنا ہے، کیا تم ممبئی چھوڑ سکو گے۔'

''بھائی کا حکم اور میرا سر۔ میں کل ہی ایودھیا جاتا ہوں اور اسپتال کی لوکیشن دیکھ کر آپ کو اطلاع دوں گا''

امریکہ کے اس کے دفتر میں ایک خوبصورت لڑکی شہانہ کام کرتی تھی جس کے والد کافی دنوں سے امریکہ میں تھے اور اب امریکن ہو گئے تھے۔ شہانہ بڑی ذہین اور شرمیلی لڑکی تھی۔ سیٹھ دھرمندر نے اپنے تجربے سے جب اچھی طرح سمجھ لیا کہ سکندر کا دل شہانہ کے لئے ڈھڑکتا ہے، تو انہوں نے اس کے والد سے بات کی۔ انہیں کیا انکار ہوتا۔ وہ دلہن بنکر
اس کے گھر آ گئی۔ سکندر کی زندگی خوشیوں سے بھر گئی۔ ایک سال کا عرصہ گزر گیا۔ ایودھیا میں زمین خرید لی گئی۔ اسپتال تیزی سے بننا شروع ہو گیا۔ سکندر کے بیٹے آفتاب کی پہلی سال گرہ پر اس اسپتال کا افتتاح رکھا گیا۔ وہ بیوی اور بچے کے ساتھ اپنے وطن پہنچا۔ افتتاحیہ تقریر میں اس نے کہا۔ 'میں ایودھیا کا ایک معمولی خادم ہوں۔ میرا فرض ہے کہ اپنی سرزمین کے لئے کچھ کروں۔ میں نے اپنی آنکھوں سے رام کی اس زمیں پر انسانوں کا خون بہتے ہوئے دیکھا ہے۔ خوف اور دہشت دیکھی ہے۔ وہ گزری ہوئی بات ہے۔ ہم سب ایک ہیں۔ سب اپنے ہیں کوئی غیر نہیں۔ یہ خیراتی اسپتال جسے میرا بھائی آپ کی رہنمائی اور اپنی نگرانی میں چوبیسوں گھنٹے جاری رکھے گا۔ آپ لوگوں کی اپنے بوڑھے بزرگوں، ماؤں بہنوں کی خدمت میں اپنے باپ، دادا، چاچا کی دعاؤں سے میری اور میرے بھائی کی یہ ایک چھوٹی سی کوشش ہے۔ آگے بھی جیسا ہم سے ہو سکے گا، آپ کی خدمت کرتے رہیں گے۔

ایک ماہ اپنی سرزمین کی خدمت کرنے کے بعد وہ واپس امریکہ لوٹ گیا اور کاروبار میں مصروف ہو گیا۔ ہر سال ارادہ بنتا کہ اپنی سرزمین کی کچھ دنوں خدمت کرے لیکن ہر بار کوئی نہ کوئی ضروری کام آ جاتا۔ اسی میں آٹھ سال نکل گئے۔ اس دوران وہ کبھی بھی افریقہ کے پولیس والوں کو نہیں

بھولا اور وقت وقت پر ان کو کچھ نہ کچھ رقم بھیجتا رہتا تھا۔

ایک دن صبح جب سارا نیویارک دہل گیا تو اس کا اثر سکندر کی زندگی پر بھی پڑا۔ اس کی بیوی اور بچہ کار سے آ رہے تھے کہ بلوائیوں کے حملہ میں گھر گئے۔ پولیس نے مشکل سے دونوں کی جان بچائی۔ ایک خاص طبقہ پر اس طرح حملہ ہوتے دیکھ سیٹھ دھرمندر نے اسے اور اس کے زخمی بیوی بچے کو اپنی گجرات کی سورت والی فیکٹری کو سنبھالنے کے لئے بھیج دیا۔ اب سکندر کی نظروں میں ایودھیا، ممبئی، سیرالیون اور نیویارک کا منظر گھومتا رہتا۔ اب وہ زیادہ غم زدہ رہنے لگا تھا۔ اس کی بیوی اور بچے کو اسپتال سے فارغ ہوئے ابھی کچھ ہی دن ہوئے تھے کہ گجرات میں فساد ہو گیا۔ اس کی کار بھی اس کی زد میں آ گئی۔ وہ شدید زخمی ہوا۔ رفاقت بھاگا بھاگا اپنے بھائی کے پاس پہنچا اور اسکی تیمارداری میں لگ گیا۔ جب اسے پہلی بار ہوش آیا تو اس نے ایودھیا جانے کی تمنا کی۔ پھر جب جب بھی ہوش آیا اس کی زبان پر ایودھیا جانے کی خواہش آ جاتی۔ کبھی وہ نیند میں بڑبڑاتا 'شہانہ میں رہوں یا نہ رہوں، تم اور آفتاب ایودھیا سے دور مت رہنا۔ ہمارا شفا اسپتال سب کی خدمت کے لئے ہے۔ ہم بھی وہاں جا کر اپنوں کی خدمت کریں گے۔' رفاقت نے ڈاکٹروں سے بات بھی کی کہ وہ خود ایک ڈاکٹر ہے۔ وہ اپنی ذمہ داری پر اپنے بھائی کو ایودھیا لے جانا چاہتا ہے، لیکن اجازت نہیں ملی۔ پھر ایک دن اس کا جسم زخموں کی تاب نہ لا سکا اور اس کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔ اس کے مردہ جسم کو ایودھیا لایا گیا جہاں پورے علاقے اور قرب وجوار سے آئے جم غفیر نے آنسوؤں کا نذرانہ پیش کرتے ہوئے اسے سپرد خاک کیا۔ وصیت کے مطابق اس کی بیوی شہانہ اسپتال میں ہی مریضوں کی خدمت کر رہی تھی۔ لیکن اس کا بیٹا جب اپنے باپ کو یاد کرتے ہوئے اس کی شفقت بیان کرتا تو سب کی آنکھیں نم ہو جاتیں۔ اس کے باپ نے ایسا کیا جرم کیا تھا جس کی سزا اسے دی گئی؟۔ اس کے اس سوال کا کسی کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔

وجیہہ احمد اندرابی

سزا کس جرم کی

ایک فکری تجزیہ

عالمی انتہا پسندی کے نتیجے میں ہو رہے خون خرابے کے پس منظر میں لکھی گئی وحشی سعید کی طویل کہانی ''سزا کس جرم کی'' وطن سے محبت کے اظہار کی ایک کامیاب کوشش ہے۔ انتہا پسندی کی نہ تو کوئی سرحد ہوتی ہے اور نہ مذہب۔ انسانی خون بہانے والے جنونی انتہا پسند کا تعلق کسی بھی ملک اور مذہب سے نہیں ہوسکتا ہے۔ انتہا پسندی کے نظریات کو گزشتہ نصف صدی کے دوران جو زبردست فروغ ملا ہے انسانیت اُس سے خوف زدہ بھی ہے اور شرمندہ بھی۔ خودکش حملوں اور بم دھماکوں کے نتیجے میں آج تک ہزاروں نہتے اور بے گناہ انسانوں کا خون بہایا جاچکا ہے۔ ان میں پھول جیسے معصوم بچے، خواتین اور بزرگ لوگ شامل ہیں۔ بھارت میں تیزی سے فروغ پا رہی انتہا پسندی لوگوں کے لئے تشویش کا باعث بنی ہوئی ہے۔ بابری مسجد کے انہدام نے انتہا پسندوں کے افسروں کو بلا بخشی ہے اور ان کی سرگرمیوں میں تسلسل کے ساتھ اضافہ ہو رہا ہے۔

حالات کی مجبوری کے باعث ہجرت اور دلوں میں وطن کی محبت کے موضوعات پر اُردو کے معروف ادیبوں نے بہت سی کہانیاں لکھی ہیں اور انہیں مقبولیت بھی حاصل ہوئی ہے۔ وحشی سعید کی کہانی اسی سلسلہ میں ایک اضافہ ہے جو بابری مسجد کی مسماری اور اس کے بعد رونما ہونے

والے دہشت گردانہ واقعات کا احاطہ کرتی ہوئی وطن کی محبت کو اُجاگر کرتی ہے۔ کہانی کے مرکزی کردار فرقان، اس کا بیٹا سکندر اور اس کی بیوی سبھی اجودھیا سے محبت کرتے ہیں۔ اس کی مٹی سے انہیں محبت ہی نہیں عقیدت بھی ہے۔ اس لئے کہ اس مٹی میں ان کا جنم ہوا اور اس مٹی میں انہیں دفن ہونا ہے۔ سکندر کی زبان سے ادا ہوئے ان جملوں سے اجودھیا سے اس کے قلبی لگاؤ کا اظہار ہوتا ہے۔۔۔

''مجھے تو ہر روز خیال آتا ہے کہ ممبئی چھوڑ کر اجودھیا چلا جاؤں''

''اجودھیا میری روح ہے، رفاقت ہے۔ جس ڈر سے ہم اجودھیا چھوڑ کر بھاگے تھے وہ حادثہ یہاں بھی تو ہو گیا''

''اگر ابا اجودھیا چھوڑ کر نہ آئے ہوتے تو شاید ہمارے سب گھر والے زندہ ہوتے''

''جہاں خطرہ ہوتا ہے وہاں تحفظ کی راہیں بھی ہوتی ہیں۔ اب میں سمجھتا ہوں کہ ہمیں وہیں رہ کر حالات کا سامنا کرنا چاہیے تھا۔ سب اپنے ہی تو تھے۔ وہ تو حالات کی ستم ظریفی تھی۔ کچھ دنوں کے بعد سب کچھ ٹھیک ہو گیا''

''اب کہا کرتے تھے، موت کا ایک دن مقرر ہے۔ جب مرنا ہے تو اس مٹی میں جہاں جنم لیا ہے، دفن ہوا جائے۔ ابا شاید خوف کے عالم میں اپنی کہی ہوئی بات بھول گئے تھے''

وطن کی محبت انسانی فطرت کا تقاضا ہے۔ وطن سے ہجرت انسان انتہائی مجبوری میں تو کرتا ہے لیکن اس کا دل وہیں اٹکا رہتا ہے اور یہ محبت اسے بے چین کئے دیتی ہے۔ ''سزا کس جرم کی'' کے مرکزی کردار بابری مسجد کے انہدام کی کارروائی کے نتیجے میں خوفزدہ ہو کر ممبئی ہجرت تو

کرتے ہیں لیکن اجودھیا کی محبت انہیں بے چین کئے رہتی ہے۔ ستم ظریفی دیکھئے یہی صورت حال انہیں ممبئی میں بھی پیش آتی ہے اور ممبئی بھی بم دھماکوں سے دہل اُٹھتا ہے۔ سکندر نیویارک پہنچتا ہے تو یہاں بھی اس کا واسطہ دھماکوں سے پڑتا ہے اور جب گجرات پہنچتا ہے تو ایک زبردست بم دھماکے کے نتیجے میں زخمی ہوکر داعی اجل کو لبیک کہتا ہے۔ لیکن مرتے وقت بھی اجودھیا اس کی آنکھوں کے سامنے ہوتا ہے۔ وہ اجودھیا کی مٹی میں دفن ہونے کی خواہش بھی رکھتا ہے اور اپنی بیوی کو مستقل طور اجودھیا میں رہنے کی ہدایت بھی دیتا ہے۔

کہانی کا مرکزی خیال بھی یہی ہے کہ موت کے خوف سے وطن کو چھوڑنا دانائی نہیں۔ خاص طور پر اس پیش منظر میں کہ دنیا کے تقریباً سبھی ممالک فی الوقت دہشت گردی کے نشانے پر ہیں اور بم دھماکے کہیں بھی کسی بھی وقت ہوسکتے ہیں۔

کہانی کی طوالت کچھ کم بھی کی جاسکتی تھی اور کہانی کار اس کا حجم کم کرکے بھی اپنی بات قارئین تک پہنچا سکتے تھے۔ تاہم یہ بات بھی اپنی جگہ صحیح ہے کہ کہانی کی طوالت پڑھنے والے کو بور نہیں کرتی۔ یہ بھی کہانی کی کامیابی کا ایک ثبوت ہے۔



سستا لہو

''منو۔آج تم شہر جارہے ہو۔کالج میں ٹھیک سے پڑھائی کرنا۔تمہیں بڑا آدمی بننا ہے بیٹا۔آج تمہاری ماں زندہ ہوتی تو ۔ ۔ ۔ خیر ۔ ۔ ۔''

''ارے یار بس بھی کرو۔ بیٹا پہلی بار شہر پڑھائی کے لئے جارہا ہے۔اس کو ہنسی خوشی رخصت کرو''

''ہاں ہاں۔ بیٹا ایک بات یاد رکھنا کہ میرا تمہارے علاوہ کوئی سہارا نہیں ہے''

باپ بیٹے گلے ملے۔اختر خان نے اس کا سامان اس کی برتھ پر رکھا اور ریل گاڑی نے سیٹی دے دی۔اختر خان اور منو کے والد گاڑی سے اُتر گئے اور منو اپنی نئی منزل کی اور روانہ ہوگیا۔

''خان۔منو کب واپس آئے گا؟''

''ارے یار بتایا تو ہے کہ کم از کم ایک سال کے بعد۔ ویسے بی اے کا کورس تو تین سال کا ہوتا ہے، لیکن ہر سال دو ماہ کی چھٹی بھی ہوتی ہے۔ وہ دو سال میں چار ماہ تو وہ یہیں رہے گا اور تیسرے سال پڑھائی پوری کر کے بڑا افسر بن جائے گا، تو تم اُس کے پاس ہمیشہ کے لئے رہو گے''

''خان، جب منو بڑا افسر بن جائے گا تو میں تیری بیٹی سے اُس کا نکاح کروں گا۔ یہ میرا وعدہ ہے''

منو، جس کا اصل نام اقبال تھا پہلے بھی کئی بار شہر آچکا تھا، لیکن شہر کی زندگی اُسے پسند نہیں تھی۔ وہ گاؤں کا سیدھا سادہ نوجوان تھا۔ شہر کی گندگی سے دور۔

ہوسٹل میں اپنا سامان رکھنے کے بعد وہ پڑھائی میں گم ہو گیا۔ اس کے کمرے میں ایک طالب علم تھا جس کا نام جمال علی تھا۔ وہ امیر باپ کا بیٹا تھا اسی شہر کا رہنے والا۔

''احسن وِلا'' ۔ ۔ جو کہ اس کے شاندار مکان کا نام تھا، کے ہوتے ہوئے بھی اس نے ہوسٹل میں بھی مسکن بنایا ہوا تھا۔ دراصل اپنے شراب وشباب کے شوق وہ اسی کمرے میں پورے کرتا تھا۔ لیکن اقبال کو ان سب چیزوں سے کوئی مطلب نہیں تھا۔ اس کا سفر کالج سے ہوسٹل تک محدود تھا۔ وہ غریب باپ کا غریب بیٹا تھا۔ اُسے تو اسی بات کا فخر تھا کہ جمال علی اسے بھائی مانتا ہے۔ حالانکہ جمال علی کی نظروں میں وہ ایک غریب دیہاتی کے علاوہ اور کچھ نہ تھا۔ لیکن اپنی میٹھی میٹھی باتوں سے وہ اپنے بہت سے کام اقبال سے کرواتا تھا اور کبھی کبھی غریب سمجھ کر کچھ پیسے بھی اس کی جیب میں ڈال دیتا تھا۔ ایک دن جمال علی کو اپنا کچھ سامان گھر سے ہوسٹل لانا تھا۔ اس نے اقبال کو ساتھ لیا اور اپنے گھر پہنچ گیا۔ احسن ویلا دیکھ کر اقبال کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

''ہاں اقبال دیکھو۔ یہ سارا سامان تم اپنی پیٹھ پر لادلو اور باہر سے رکشا کر لینا اور کمرے میں سارا سامان بہ حفاظت رکھ دینا۔ میں شام کو آؤں گا''

''جی بھائی'' ۔ ۔ اقبال سامان کو اپنی پیٹھ پر لادنے جا ہی رہا تھا کہ جمال علی کی بہن جس کی عمر تقریباً 30 سال تھی اور جس کا خاوند چار ماہ قبل ہی فوت ہو چکا تھا، آ گئی۔ اقبال کے خوبصورت جسم کو دیکھ کر اس کے بدن میں ہوس کے شعلے جاگ اُٹھے۔

''تم کون ہو ۔ ۔ ؟''

''جی ۔ ۔ جی ۔ ۔ میں ۔ ۔ وہ ۔ ۔ جمال بھائی کے ساتھ آیا تھا۔ میں اور وہ

ہوسٹل میں ایک ہی کمرے میں رہتے ہیں۔اُنہوں نے کہا ہے کہ سامان اُٹھا کر کمرے میں پہنچا دوں"

"ٹھیک ہے۔سارا سامان یہی ہے کہ کچھ چھوٹا بھی ہے"

"مجھ سے تو انہوں نے یہی کہا ہے"

"ٹھیک ہے۔ایسا کرنا کہ تم کل پھر آجانا۔یہ لو پیسے اور بازار سے میرے لئے مٹھائی اور پھل لیتے آنا"

"جی"

دوسرے دن جب وہ احسن وِلا پہنچا تو جمال کی بہن اُسے اپنے کمرے میں لے گئی۔

"یہاں مٹھائی اور پھل رکھ دو۔اور آؤ میرے پاس بیٹھ کر اپنے بارے میں کچھ بتاؤ"

"جی میں ۔ ۔ ۔"

"ہاں ہاں آؤ بیٹھو۔گھبراؤ نہیں" ۔ ۔ اس نے اقبال کا بازو پکڑ کر اپنے پاس بٹھالیا اور اس کے پیروں پر اپنے پیر رکھ دیے۔

"اچھا یہ بتاؤ، میں خوبصورت ہوں"

"جی ۔ ۔ جی ۔ ۔ آپ تو بہت خوبصورت ہیں"

"اچھا بتاؤ، تمہیں میرے چہرے میں سب سے خوبصورت کیا لگتا ہے ۔ ۔ ؟"

"جی ۔ ۔ جی ۔ ۔ آپ کے کانوں کے بالے۔یہ سونے کے ہیں نا ۔ ۔"

"ہاں، سونے کے ہیں۔لیکن یہ تمہیں کیوں سب سے زیادہ اچھے لگتے ہیں؟"

"جی ۔ جی وہ۔جب میں بڑا آدمی بن جاؤں گا اور میری شادی ہوگی اور میں اپنی

دلہن کے لئے اسی طرح کے سونے کے بالے خریدوں گا'' ۔ ۔ اقبال نے شرماتے ہوئے جواب دیا۔

''اس دیہاتی نے جوانی کا بھی کچھ سبق سیکھا ہے یا شہر میں آ کر بھی پوری طرح گاؤں کا دیہاتی ہی رہا'' ۔ ۔ وہ من ہی من بڑبڑائی۔ وہ کچھ کہنے والی ہی تھی کہ جمال علی وہاں آ گیا۔

''ارے اقبال۔ تم یہاں کیسے؟'' جمال نے حقارت سے پوچھا۔

''وہ ۔ ۔ وہ بھیا، کل میں نے اس سے مٹھائی اور پھل منگایا تھا۔ یہ لے کر آیا ہے تو میں نے ہی اسے روک لیا کہ اس سے اس کے گاؤں کی کچھ باتیں کروں'' ۔ ۔ جمال کی بہن نے اس کی نظر بچا کر اپنا پیر اقبال کے پیر سے دھیرے سے ہٹا لیا۔

''ٹھیک ہے۔ لیکن بہن تم اس سے پھر کبھی باتیں کرنا۔ ابھی مجھے اسے لے کر کہیں جانا ہے۔ ہاں اقبال تم نیچے بیٹھو۔ میں ابھی آتا ہوں''

''جی بھائی''

اقبال کے جانے کے بعد اس نے اپنی بہن سے سخت لہجے میں کہا ۔ ۔

''آپ اتنے بڑے گھر کی بیٹی ہیں اور اس دیہاتی غریب کو اپنے بیڈروم تک لے آئیں''

''وہ بھیا مٹھائی اور پھل رکھنے تھے نا''

''ٹھیک ہے، لیکن آئندہ اسے مت بلانا۔ میں بھی خیال رکھوں گا کہ یہ گھر کبھی نہ آنے پائے''

بی اے کے آخری سال کا نتیجہ آیا تو اقبال خوشی سے جھوم اُٹھا۔ وہ اوّل نمبروں سے پاس ہوا تھا۔ جمال فیل ہو گیا تھا، لیکن اس کے والد نے اسے کاروبار سنبھالنے کے لئے کالج

سے نکال لیا۔

اقبال ہوسٹل آ کر گاؤں جانے کے لئے سامان باندھ ہی رہا تھا کہ ڈاکیہ خط لے کر آیا۔

خط میں لکھا تھا ۔ ۔ ۔

''فوراً چلے آؤ۔ تمہارے والد بہت بیمار ہیں''

جب وہ گاؤں پہنچا تو والد نہیں ملے بلکہ ان کی قبر ملی۔ وہ زاروقطار رو دیا۔ پھر والد کا خواب پورا کرنے کے لئے شہر آ گیا۔

لیکن اب اس پر زندگی کی اصلی حقیقت آشکار ہو رہی تھی۔ اوّل درجہ کی ڈگری کے باوجود اُسے نوکری نہیں مل رہی تھی۔ ہر جگہ سفارش، صلاحیت کی کوئی قدر نہیں۔ دھیرے دھیرے اس کے پیسے ختم ہو گئے اور فاقوں کی نوبت آ گئی۔ دو دن بھوکا رہنے کے بعد اس کے دماغ میں آیا کہ کیوں نہ ''احسن وِلا'' چلوں۔ وہاں جمال بھائی کی سفارش سے کوئی نہ کوئی نوکری مل جائے گی۔ یہ خیال آتے ہی اس نے خود کو تازہ دم محسوس کیا اور تیز قدموں سے احسن وِلا کی جانب چل پڑا۔

''ارے ۔ ۔ تم تو ۔ ۔ وہ ۔ ۔ '' جمال کی بہن نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

''جی ہاں ۔ ۔ میں اقبال ہوں جو جمال بھائی کے ساتھ ہوسٹل میں رہتا تھا۔ اصل میں، میں بے روزگار ہوں اور جمال بھائی سے مدد مانگنے آیا تھا کہ اگر وہ سفارش کر دیں تو مجھے کوئی نہ کوئی نوکری ضرور مل جائے گی''

''لیکن جمال تو یہاں نہیں ہے۔ وہ لندن گیا ہوا ہے''

''تو پھر ۔ ۔ وہ مایوسی سے پلٹنے لگا''

''لیکن رکو۔ جاتے کہاں ہو۔ جمال نہیں ہے تو کیا ہوا، اُس کی بہن تو ہے۔ لیکن پہلے تم کھانا کھاؤ۔ لگتا ہے کئی دنوں سے کچھ نہیں کھایا''

اقبال کھانے پر بھوکے شیر کی طرح ٹوٹ پڑا۔ کھانے سے فارغ ہوا تو جمال کی بہن اُسے اپنے کمرے میں لے گئی۔

''تمہاری شادی ہوگئی''

''نہیں''

''تمہیں معلوم ہے شادی کے بعد کیا ہوتا ہے'' ۔ ۔ اقبال شرما گیا۔

''ارے ایک لڑکا ایک لڑکی دو جسم ایک جان ہو جاتے ہیں۔ ایک دوسرے کا نام لے کر پکارتے ہیں، جیسے تمہارا نام اقبال اور میرا نام نجمہ۔ شادی میں جہیز بھی ملتا ہے۔ بیڈ، زیور ۔ ۔ تم نے میرا بیڈ دیکھا۔ آؤ میں تمہیں دکھاتی ہوں''

وہ اس کا بازو پکڑ کر بیڈ کے پاس لے گئی اور زبردستی اُسے لٹا دیا۔

''کیسا لگ رہا ہے ۔ ۔؟''

''یہ تو بہت نرم ہے۔ اس پر سونے کے بعد تو کوئی بھی خوابوں کی سیر کرنے لگتا ہوگا''

''تمہیں اس پر سلا کر خوابوں کی سیر بھی کراؤں گی، لیکن اس سے پہلے تم میرے نرم جسم کی سیر تو کرلو''

یہ کہہ کر وہ اقبال پر بھوکی شیرنی کی طرح ٹوٹ پڑی۔ اس کے نرم جسم کے لمس سے اقبال کا جسم بھی دہکنے لگا۔ دونوں نے اپنے کپڑے اُتار پھینکے۔ دو گھنٹے تک ایک دوسرے کے جسم سے جدو جہد کے بعد اقبال نے اُٹھ کر کپڑے پہنے۔ نجمہ برہنہ ہی بیڈ پر پڑی رہی۔ ایسا لگتا تھا کہ اس کی بھرپور پیاس آج ہی بجھی تھی۔ اس نے اقبال کے جسم کے ہر عضو سے رس نچوڑ لیا تھا اور نڈھال پڑی تھی۔ جب اقبال جانے لگا تو وہ برہنہ ہی اُٹھی۔ اپنے جسم کو اس کے جسم سے چمٹا کر

اس کے ہونٹوں پر بھرپور بوسہ دیتے ہوئے اس کی قمیص کی جیب میں 50 روپے ڈالتے ہوئے بولی

۔۔۔

''اگر تم پچاس روپے روزانہ کمانا چاہتے ہو تو میرے پاس آجانا''

اب اقبال کی راتیں روز رنگین ہونے لگیں۔ نجمہ اس کی بھرپور جوانی کا رس پی کر خود کو سیراب کر رہی تھی۔ چھ ماہ تک یہی سلسلہ چلتا رہا۔ اقبال کافی کمزور ہو گیا تھا۔

ایک دن وہ نجمہ کی ہوس پوری کرنے کے بعد سیڑھیوں سے نیچے اُتر ہی رہا تھا کہ جمال علی آ گیا۔

''ارے اقبال تم یہاں''

''ہاں بھائی وہ ۔۔۔''

''اچھا تم یہاں بیٹھو۔ میں ابھی آتا ہوں''

''وہ دیہاتی ذلیل یہاں کیوں آتا ہے جب کہ میں نے تین سال پہلے ہی منع کیا تھا کہ یہ بھکاری دوبارہ یہاں نہ آنے پائے''

''میں کیا کرتی بھیا۔ یہ تو چھ ماہ سے آ رہا ہے۔ تمہارا دوست تھا۔ تمہیں ڈھونڈتا ہوا آیا اور کہنے لگا کہ بے روزگار ہوں، کہیں سفارش کر کے نوکری دلوا دیجئے۔ اب بھلا میں کیا کرتی۔ روز تمہیں پوچھتا ہوا آتا ہے اور اپنی بے کاری کا رونا روتا ہے، تو میں بھکاری سمجھ کر دس بیس روپے تمہارا صدقہ اسے دے دیتی ہوں''

اقبال نیچے کھڑا یہ سب سن رہا تھا۔ اسے یقین نہیں آیا۔ ایسا لگتا تھا کہ اس کے پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی ہو۔ پورا جسم مانوشل ہو گیا تھا۔ جس جمال کو وہ بھائی کہتا تھا، اس کا ہر کام

کرتا تھا، وہ اسے بھکاری سمجھتا تھا۔ دوسرے ہی پل اس نے اپنے ہوش پر قابو پایا اور وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔ بدحواسی کی حالت میں وہ چوراہے تک پہنچا کہ یکا یک اسے محسوس ہوا کہ آسمان چکر کھا رہا ہے۔ زمین اور مکان گھوم رہے ہیں۔ وہ گر پڑا اور ایسا گرا کہ دوبارہ اُٹھ نہ سکا۔ ایک گاڑی اسے ٹکر مارتی ہوئی تیز رفتار سے جا چکی تھی۔ رات بھر اس کا خوف سے سنا ہوا مردہ جسم سڑک پر پڑا رہا۔ صبح میونسپلٹی کی گاڑی لاش کو اُٹھا لے گئی، اُس جگہ دفنانے کے لئے جہاں اس کے جیسے بہت سے سستے لہو کے مالک دفن تھے۔



شارق عدیل

وحشی سعید اور ''سستا لہو''

وحشی سعید کی کہانیاں اپنے ہی انداز سے قرطاس پر قدم رکھتی ہیں اور اختتام کی منزل میں پہنچ کر تو اس قدر پُر اثر ہو جاتی ہیں کہ قاری دیر تک انہیں سوچتا رہتا ہے۔ ''سستا لہو'' وحشی سعید کی ایک ایسی کہانی ہے جو دولت اور غربت دونوں کی فراوانی کی چھاؤں میں، ایک دولت مند بیوہ کی چنگاڑتی ہوئی جسمانی خواہشات کا احاطہ کرتے ہوئے یہ باور کراتی ہے کہ دولت کی بہتات انسان کو گمراہ کر دیتی ہے اور اس کے برعکس غربت کی ستم ظریفی بھی انسان کو ایسے کاموں پر آمادہ کر لیتی ہے جنہیں وہ کرنا نہیں چاہتا ہے۔ ''سستا لہو'' کے کرداروں میں صرف تین نام ہی اہم ہیں ۔۔ اقبال، جس کی زندگی غربت کے اندھیرے میں ڈوبی ہے، جمال علی ۔۔ ایک امیر و کبیر تجارتی انسان کی عیاش مزاج اولاد ہے۔ اس لئے وہ دولت کے ہر ناجائز استعمال سے واقف ہے اور اس کی نظر میں تعلیم کی بھی کوئی وقعت نہیں ہے، اور تیسرا کردار جمال علی کی بہن نجمہ کا ہے جو اقبال کے مضبوط کسرتی جسم کو اپنی ہوس گزیدہ نظروں سے چاٹتی رہتی ہے۔ وحشی سعید نے کہانی کا عنوان ''سستا لہو'' رکھا ہے جو چونکاتا ہے۔ لیکن کہانی کو پڑھنے کے بعد محسوس ہوتا ہے کہ اس کا عنوان کچھ اور ہی ہونا چاہیے تھا کیونکہ امیری اچھا خاندان ہونے کی ضمانت نہیں ہے اور نہ ہی غریبی غیر اہم خاندان ہونے کی علامت ہے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس دنیا کی کرشماتی شخصیات زیادہ تر غریبی کی گلی سے ہی برآمد ہوتی ہیں۔ اس لئے صرف غریبی کی بناء پر کسی کے لہو کو سستا تصور نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اب کہانی کے ایک ایسے مناظر کو ملاحظہ فرمائیں جو امیری اور غریبی کے فرق کو بیان کرنے کے لئے وجود میں آیا ہے۔

جمال علی کو اپنا کچھ سامان اپنے گھر سے کالج کے ہوسٹل میں لانا تھا، اس لئے اس نے اقبال کو ساتھ لیا اور گھر پہنچ گیا۔ اس کے محل نما گھر کو دیکھ کر اقبال کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اقبال، جمال علی کی ہدایت پر سامان اُٹھانے کے عمل سے گزرنے ہی والا تھا کہ جمال علی کی بہن آگئی جس کی عمر تقریباً تیس سال تھی اور اس کا خاوند بھی فوت ہو چکا تھا۔ اقبال کو دیکھ کر اس کے اندر جنسی خواہشات کروٹیں بدلنے لگتی ہیں اور وہ اسے حاصل کرنے کے منصوبے بنانے لگتی ہے۔

کہانی کا یہ منظر رئیس زادیوں کی بے اعتدالیوں کی طرف اشارہ کرتا ہے اور یہ واضح کرتا ہے کہ زر کی بے تحاشہ فراوانی نے امیروں کی عورتوں کو بھی مردوں کا ہم قدم بنادیا ہے جب کہ فطرتاً عورت عیاش نہیں ہوتی ہے۔ لیکن امیر زادوں کی آوارگی نے اسے بھی جنسی لذتوں کا اسیر بنادیا ہے اور وہ یہ بھولتی جارہی ہے کہ اس کے اندر ایک ماں بھی رہتی ہے، جس کے جذبات ممتا اور طہارت کی بنیاد ہوا کرتے ہیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ رئیس زادے اپنی بداعمالیوں پر قابو رکھیں تا کہ ان کی بہنیں ان کے اعلیٰ اور شفاف کردار سے سبق حاصل کریں اور اپنی عصمتوں کی حفاظت کریں، کیونکہ عورت کا اُٹھایا ہوا ایک غلط قدم پورے خاندان کو رسوائی کی غار میں دھکیل دیتا ہے جس کا خمیازہ کئی نسلوں کو بھگتنا پڑتا ہے۔ یہاں سے کہانی پھر اپنے مرکز کی طرف روانہ ہو جاتی ہے اور جمال علی کی بہن کی لذت شناس اُمنگوں کو نمایاں کرنے لگتی ہے۔ مثلاً اقبال کے جانے کے بعد جمال علی نے اپنی بہن نجمہ کو سخت لہجے میں ڈانٹتے ہوئے تاکید کی۔ آپ اتنے بڑے گھر کی بیٹی ہیں اور اس غریب دیہاتی کو اپنے بیڈروم تک لے آئیں۔ لیکن جمال علی نے اپنی بہن کو سرزنش کرتے ہوئے ایک لمحے کے لئے بھی اپنے بدنما کردار پر نظر نہیں ڈالی، صرف اس لئے کہ وہ ایک مرد ہے اور اس کے لئے بدترین افعال بھی جائز ہیں۔ اس کے بعد کے منظر میں اقبال کے والد کا انتقال ہو جاتا ہے اور دھیرے دھیرے اس کی زندگی بھوک کے گرفت میں آنے لگتی ہے، اور جب پوری طرح بھوک اس کے اندر پاؤں پسار لیتی ہے تو اسے خیال آتا ہے کہ جمال علی کی سفارش سے کوئی نہ کوئی نوکری ضرور مل جائے گی اور اس خیال کے آتے ہی وہ اپنے اندر توانائی محسوس کرنے لگتا ہے اور اس کے

قدم خود بخود اپنی منزل کی طرف گردش کرنے لگتے ہیں جہاں نجمہ کا دہکتا ہوا جسم کئی مہینوں سے اس کا قرب حاصل کرنے کے لئے تڑپ رہا تھا اور یکا یک اقبال کو وہ اپنے دروازے پر دیکھ کر حیران رہ جاتی ہے اور صرف اتنا کہہ پاتی ہے ۔ ۔ "ارے تم" اور اس کے جواب میں اقبال صرف اتنا ہی کہہ پاتا ہے کہ میں بے روزگار ہوں۔ بھوک کی کراہوں سے گزرتے ہوئے ایک پڑھے لکھے نوجوان کو یہ کہنے کے لئے بھی کتنے عذابوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ اس کا اندازہ فائیو اسٹار ہوٹل میں بیٹھ کر نہیں لگایا جاسکتا کیونکہ انسان بھوک کے جال میں پھنستے ہی ایسے کام کرنے کے لئے آمادہ ہوجاتا ہے جو مہذب معاشرے میں بری نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔

اس کے بعد کے منظر میں نجمہ کے اندر چھپی ہوئی وصل کی پیاسی عورت پوری طرح بیدار ہوجاتی ہے اور اقبال کو کھانا کھا کر جانے کے بہانے روک لیتی ہے۔ کئی روز کی بھوک نے اقبال کے اندر انکار کی جرأت کو ہلاک کر دیا اور وہ پوری طرح اپنی بھوک کو مطمئن کرنے لگا، جب کہ نجمہ اپنے ناپاک ارادے کو انجام دینے کی تگ ودو میں مصروف تھی اور موقع ملتے ہی اقبال کو اپنی بانہوں میں جکڑ لیتی ہے، تو اقبال کے اندر کا مرد اس کے نرم وگداز جسم کا لمس پاتے ہی جاگ جاتا ہے اور دونوں کے بدن لباسوں کی قید سے آزاد ہوجاتے ہیں اور ایک دوسرے سے اس طرح چمٹ جاتے ہیں کہ ہوا کے گزرنے کے امکان بھی مفقود نظر آتے ہیں۔ کہانی کا یہ اقتباس یہ باور کراتا ہے کہ جوان بیوہ عورت کی دوسری شادی میں زیادہ دیر نہیں کرنی چاہیے کیونکہ وہ مرد کے لمس سے سیراب ہونے کے بعد اس کی فرقت کا دُکھ جھیل نہیں پاتی ہے اور کسی بھی وصل آمادہ نازک لمحے میں بہک جاتی ہے۔

ایک دن اقبال نجمہ کی پیاس بجھانے کے بعد سیڑھیوں سے اُتر ہی رہا تھا کہ جمال علی آجاتا ہے اور اسے دیکھ کر غصے میں اپنا آپا کھو بیٹھتا ہے۔

یہاں وحشی سعید نے عورت کے مکر کو ایک ماہر نفسیات کی طرح افسانے کی زبان میں

تحریر کیا ہے ۔ ۔ ۔

''میں کیا کرتی بھیا۔ یہ تو چھ ماہ سے آ رہا ہے ۔ بھکاری سمجھ کر دس بیس روپے تمہارا صدقہ اسے دے دیتی ہوں''

یہ ہے عورت کی فطرت میں بسا ہوا مکر جس کا شکار مرد آسانی سے ہو جاتا ہے۔ اور اقبال ان دونوں کی تیز آواز گفتگو کو ادھورا چھوڑ کر ہی بھاگ کھڑا ہوتا ہے اور بدحواسی کے عالم میں اسے کائنات کی ہر شئے گھومتی ہوئی نظر آتی ہے اور وہ زمین پر گر پڑتا ہے اور تمام رات اس کا مردہ بدن سڑک پر ہی پڑا رہتا ہے۔ صبح میونسپلٹی گاڑی اسے دفانے کے لئے وہاں لے جاتی ہے جہاں اس کے جیسے بہت سے سستے لہو کے مالک انسان دفن ہیں۔ کہانی کا اخری جملہ اپنے معنوی احساس میں غربت پر ایک کھلا ہوا طنز ہونے کے ساتھ یہ سبق بھی دیتا ہے کہ تعلیم کی غرض سے گاؤں سے آنے والے غریب گھرانوں کے بچوں کو امیر طلبہ کی صحبتوں سے الگ رہنا چاہیے کیونکہ وہ وقتی صورت میں اپنی ضرورت کے تحت آپ کو اپنا ضرور بنا لیتے ہیں لیکن اپنی زندگی میں آپ کو جگہ کبھی نہیں دے سکتے۔ چونکہ وحشی سعید کی سوچیں اپنی افسانہ نگاری کے ابتدائی زمانے سے ہی حساس ہیں، اگر ایسا نہیں ہوتا تو وہ تعلیم کے دوران ''سستا لہو'' ایسی زندگی کے تجربات سے لبریز کہانی نہیں لکھ پاتے۔ کیونکہ طلبہ کہ زندگی کتابوں اور قہقہوں کے درمیان فضول مباحث میں اپنے وقت کو گنواتی رہتی ہیں۔ لیکن وحشی سعید نے اپنے لمحے لمحے کو بہترین اور شاندار ناول لکھنے میں صرف کیا ہے۔ اور ان کے اس عمل نے ہی انہیں اپنے وقت کا ممتاز افسانہ نگار بنا دیا۔



آب حیات

نواب غیاث الدین بیگ کے پاس دولت کے انبار تو نہ تھےلیکن اب تک ان کے پاس ایک قدیم خاندانی لائبریری تھی جس میں کتابوں کے کچھ نایاب نسخے موجود تھے۔اب وہ کسی قدر بوڑھے ہو گئے تھے اور ضعیف بھی۔ ان کا اکثر وقت لائبریری میں ہی گزر جاتا۔ اب وہ قدیم نایاب نسخوں میں ہمیشہ کچھ پانے کی جستجو میں لگے رہتے۔نواب صاحب کے دو ہی دوست تھے۔ ایک میر علی جواد ھیڑ عمر کے خاندانی دولت مند تھے اور دولت خرچ کرنا بھی جانتے تھے۔ان کا دوسرا دوست ایک نوجوان تھا۔ کتابوں کے مطالعہ کے شوق نے اس کو نواب غیاث الدین کے قریب کر دیا تھا۔

ایک دن کا واقعہ ہے،نواب غیاث الدین بیگ بڑے جوشیلے انداز میں لائبریری کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک ڈگ بھرتے رہے اور یہ عمل بہت دیر تک جاری رہا۔نوکر یہ سمجھنے پر مجبور ہو گئے کہ شاید ان کی مجنونانہ حرکت اپنی مرحوم بیوی کی یاد اور اس سے پیدا کردہ اضطراب کا نتیجہ ہے۔

لیکن وہ اپنے دوستوں کا انتظار کر رہے تھے۔حیات جاوداں پانے کے لئے ایک قدیم نسخہ ان کے ہاتھ آیا تھا۔ جب دوست آئے تو ان کے اضطراب میں کسی قدر کمی ہوئی۔

وہ تینوں نسخے کے بارے میں بڑی رازداری سے باتیں کرنے لگے۔تینوں کے دلوں میں حیات جاوداں کے لئے اُمنگ پورے عروج پر پہنچ گئی۔اب تک وہ تینوں یہ سمجھتے آئے تھے کہ حیات جاوداں کی اصطلاح صرف قصے اور کہانیوں کی خاطر اختراع کی گئی ہے، لیکن آج ان کو معلوم ہوا کہ اس مفروضے کے پیچھے حقیقت بھی موجود ہے۔

ان تینوں کے درمیان طے پایا کہ حیات جاوداں پانے کے لئے وہ مہم اختیار کریں جس کی نشاندہی قدیم نسخے میں کی گئی تھی۔ مہم کا آغاز سمندر کے راستے سے ہونا تھا۔ اس لئے فوراً ہی ایک سمندری جہاز کا جو جدید سائنسی آلات سے لیس تھا، انتظام کیا گیا۔ اس کے تمام خرچ کو میر علی نے برداشت کیا۔ چونکہ مہم تھی حیات جاوداں پانے کی، اس لئے اس سلسلہ میں رازداری سے کام لینا بہت ضروری تھا۔ لہذا کوئی جہازی عملہ ساتھ نہیں لیا گیا اور وہ تینوں نہایت خاموشی سے ساحل چھوڑ کر سمندر کی وسعتوں میں چلے گئے۔

قدیم نسخہ کے مطابق مہم کی پہلی منزل سمندر میں وہ جزیرہ تھا جو ہمیشہ لہروں میں ڈوبا رہتا تھا۔ تقریباً ڈیڑھ مہینے تک سمندری پانی کے بدلتے ہوئے رنگوں میں جزیرہ ان کی نظروں سے چھپا رہا۔ ان کے اردگرد مایوسی کے جال بچھنے لگے۔ شاید اسی لئے نواب غیاث الدین بیگ نے ایک دن کہا ۔ ۔ ۔

"وہ نسخہ جھوٹا ہوگا۔ چلو واپس لوٹیں"

لیکن نسخے کی صداقت کو ثابت کرنے کے لئے قدرت نے ان کے جہاز کا رُخ اُدھر کر دیا جہاں لہروں میں ڈوبا ہوا جزیرہ تھا۔ احمد تو چیخ ہی پڑا۔

"جزیرہ مل گیا ۔ ۔ جزیرہ"

وہ تینوں ایک دوسرے کو حیرت سے تکنے لگے۔

ان تینوں نے ایک ساتھ لہروں میں ڈوبے ہوئے جزیرے پر قدم رکھا۔ سرزمین پتھریلی تھی۔ یوں تو لہروں میں ڈوبے ہوئے جزیرہ پر چھن چھن کر دھوپ کی کرنیں آرہی تھیں۔ دھوپ کی حرارت سے پتھریلی زمین گرم تھی۔ وہ تینوں ننگے پاؤں گرم پتھروں کے راستے طے کرتے رہے۔ مکمل سکوت میں ڈوبے ہوئے اس جزیرے میں کسی پرندے کی چہچہاہٹ کی آواز

تھی نہ کسی حیوان کا نام ونشاں، اور انسان کا تو سوال ہی کیا۔ ان کے پاؤں میں چھالے پڑ گئے، لیکن چلتے رہے۔ وہ سب مسکراتے ہوئے ایسے چلتے تھے جیسے پھولوں کے راستے پر ان کا استقبال حوریں گلپوشی سے کر رہی ہوں۔ منزل کی سختیاں انجام کی راحت کے سامنے کیا حیثیت رکھتی ہیں!

وہ چلتے رہے اور چلتے رہے۔

قدیم نسخے کے مطابق ''حیات جاوداں'' پانے کی دوسری منزل غار کا دہانہ تھا، لیکن اب تک انہیں کوئی غار نظر نہیں آیا تھا۔ احمد نے ان کو ایک ٹیلے پر بیٹھ جانے کا اشارہ کیا۔ پھر اس نے کھانا تقسیم کیا۔ وہ کھاتے رہے اور مستقبل کے سنہرے جھولے میں جھولتے رہے۔

کھانے کے بعد سفر پھر شروع ہوا۔ سورج ڈوب گیا۔ اندھیرے نے جزیرے کو اپنے دامن میں چھپا لیا۔ وہ ایک دوسرے کو دیکھ بھی نہیں سکتے تھے لیکن ''حیات جاوداں'' پانے کی کشش ہر مشکل پر قابو پاتی رہی۔ وہ انتہائی خاموشی سے ایک ٹیلے پر بیٹھ گئے۔ اپنے سفر کی دوسری منزل کی ناکامی کا رونا روتے رہے۔ کسی نے ان کے کانوں میں کہا ۔ ۔ ۔

''جاؤ، سامنے وہ سرخ پتھر ہے، اُس کو ہٹا دو''

تینوں ایک ساتھ دوڑ پڑے اور اپنی تمام طاقت جمع کر کے سرخ پتھر کو ہٹانے لگے۔ ان کے بازو فولادی بن گئے۔ جانے ان میں قوت کہاں سے آئی تھی۔

احمد سب سے پہلے غار میں داخل ہوا۔ وہاں گھٹا ٹوپ اندھیرا تھا۔ اس کی چھت سے پانی کے قطرے ایسے گرتے تھے جیسے آسمان سے ہلکی بوندا باندی ہو رہی ہو۔ تینوں ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر مہم کی دوسری منزل پر چلتے رہے، آگے بڑھتے رہے۔ سفر کے دوسرے حصے میں ایسا محسوس کر رہے تھے جیسے ان کے بدن سے سارا خون نچوڑ لیا گیا ہو اور وہ صرف ہڈیوں کے ڈھانچے ہوں۔ ہیبت اور سقوط بھرے اس ماحول میں ''حیات جاوداں'' کا خیال اب بھی ایک

دل فریب حسینہ کی طرح ان کے دل و دماغ پر چھایا ہوا تھا۔

نہ جانے کتنے دنوں تک وہ چلتے رہے۔ وقت کا حساب اور احساس کب کا ختم ہو چکا تھا۔ کبھی کبھی یہ خیال بھی شدت اختیار کر لیتا کہ کیوں نہ واپس لوٹ چلیں۔ لیکن اب یہ بھی آسان نہ تھا۔

اچانک غار میں بجلی چمکی۔ لمحے بھر کی یہ روشنی بھی جیسے سوال بن گئی۔ آخر تم لوگوں کو ''حیات جاوداں'' کیوں چاہیے۔ نواب غیاث الدین بیگ سوچتا رہا۔ اس کے پاس رئیسانہ ٹھاٹ بھاٹ تو نہیں لیکن وہ بھیک منگا بھی نہیں۔ اب بھی مشتری بائی کے لطیف گانوں سے محفوظ ہوتا ہے اور اس کی شوخیوں میں راتیں بتائی جاتی ہیں۔ پھر ایسی عیش پسند زندگی سے فرار کیوں؟ اور ایسے غار میں ''حیات جاوداں'' کی تلاش میں مارا مارا پھرنا کیوں؟

''زندگی کے حسین پہلوؤں کو اور بھی حسین بنایا جا سکتا ہے، جب کہ زندگی امر ہو'' ۔ ۔ اس خیال نے اسے پھر مطمئن کر دیا۔

میر علی کے پاس بے حساب دولت تھی اور دولت سے وہ زندگی کی کون سی چیز خرید نہیں سکتا تھا لیکن ''حیات جاوداں'' کا کوئی مول نہیں۔ اگر یہ پانے کا موقع اسے ملے تو کترانا کیوں؟

احمد جوان تھا۔ زندگی کے اُتار چڑھاؤ سے ناواقف، لیکن مہم پسند نوجوان۔ اس نے سوچا اگر ''حیات جاوداں'' ملی تو اچھا، نہیں ملی تو کیا ہوا، ایک مہم سے تو لطف اندوز ہوں گے۔

بجلی کی چمک نے ان کے حوصلے بلند کر دیئے۔ اچانک میر علی نے بلند آواز میں کہا ۔ ۔

''مل گیا، مل گیا، دروازہ مل گیا''

تینوں خوشی کے مارے ایک دوسرے سے گلے ملنے لگے۔ رقص کرنے لگے۔ مسرت سے بھرے رقص اور بے ہنگم آوازوں نے غار کے سقوط کو درہم برہم کردیا۔ وہ ناچتے ناچتے بے سدھ ہوکر دروازے کے پاس گر گئے۔ سونے کا دروازہ خود بخود کھل گیا۔ خوشبو میں ڈوبی ہوئی ہوا کا ایک جھونکا ان کے نتھنوں میں گھس کر ان کے جسموں کو سیراب کرنے لگا۔ تینوں میں قوت واپس آگئی۔ وہ کھڑے ہوگئے اور دروازے کے اندر داخل ہوگئے۔

سفر کا تیسرا حصہ بہت ہی دلچسپ اور حیرت انگیز ثابت ہوا۔ وہاں وہ سب کچھ موجود تھا جس کا ذکر قدیم نسخے میں کیا گیا تھا۔ سرسبز باغ بہت دور دور تک پھیلا ہوا تھا۔ ان تینوں کی نظریں باغ کی آخری حدود پانے میں ناکام ہوئیں۔ وہاں آبشار تھے، خوش رنگ پرندے تھے جن کی چہچہاہٹ ایک لطیف کیفیت پیدا کررہی تھی۔ سارا ماحول ایک رومانی تاثر سے پُر تھا۔ حوروں کی قطاریں ان تینوں کے اردگرد کھڑی ہوگئیں۔ ان پر رنگ برنگ پھولوں کی بارش ہونے لگی۔ وہ اپنے آپ کو اس ماحول میں اجنبی پا رہے تھے۔ انہیں محسوس ہوا کہ ان کے کانوں کے پاس نہایت ہی شیریں اور دھیمی آواز میں کوئی کہہ رہا ہے ۔ ۔ ۔

"خوش آمدید ۔ ۔ خوش آمدید ۔ ۔ آب حیات تلاش کرنے والو ۔ ۔ خوش آمدید"

تینوں حوروں کی قطاریں توڑتے ہوئے اُس جانب دوڑنے لگے جہاں زمرد کے تالاب میں "آب حیات" ہچکولے کھا رہا تھا۔ تینوں آب حیات کے تالاب سے اپنی پیاس بجھاتے رہے۔ جب اس کام سے فارغ ہوئے تو اپنا سر بلند کرکے چلنے لگے۔ اب ان کے پاس حیات جاوداں تھی۔ ہمیشہ کے لئے وہ لافانی انسان بن گئے تھے۔

وہ ایک دوسرے سے کہنے لگے کہ موت اب ان کے لئے ایک خواب ہے، جس طرح

کل ان کے لئے حیات جاوداں پانا ایک خواب تھا۔ وہ اب کامیاب وکامران اپنی دنیا میں واپس لوٹ رہے ہیں۔

ایک سفید پرندہ اُڑتا ہوا آیا اور کچھ اخبار ان تینوں کے سامنے پھینک گیا۔ تینوں نے اخباروں کو اُٹھالیا۔ اخباروں کے سرورق پر مغل سرائے کے نزدیک ایک بھیانک ٹرین حادثہ کی خبر چھپی تھی اور مرنے والوں کی فہرست میں ان تینوں کے نام بھی تھے۔ خبر پڑھ کر تینوں حیرت سے ایک دوسرے کو تکنے لگے۔



تجزیہ نگار : ایم مبین

افسانہ ۔ ۔ آبِ حیات

تجزیہ

''آبِ حیات'' ایک طلسمی صفت ہے۔اس نام میں کچھ ایسی کشش پوشیدہ ہے اور اتنے اسرار سمائے ہوئے ہیں کہ صدیوں سے انسان اس کو پانے، اس کے اسراروں کا پتہ لگانے، اس فسانہ کی حقیقت کو دریافت کرنے کی جستجو میں لگا ہوا ہے۔ جیسے جیسے انسانوں کی عمریں گھٹتی جارہی ہیں اُن کی دلچسپی اس پُر اسرار شئے ''آب حیات'' میں بڑھتی جارہی ہے۔ وحشی سعید کا افسانہ ''آبِ حیات'' بھی ان ہی ساری باتوں کے پس منظر میں لکھا ہوا ایک علامتی افسانہ ہے۔افسانہ کے نام سے ہی ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ایک علامتی افسانہ ہے اور اس سے وابستہ ''حیات جاوداں'' کا اسرار بھی خود ایک علامت ہے۔اور اس کو پانے کے لئے سرکردہ تین انسان ۔ ۔ نواب غیاث الدین بیگ، میر علی اور احمد خود تین علامتیں ہیں جن کی تفہیم کے لئے کئی صفحات درکار ہیں۔

اپنے اس افسانہ میں وحشی سعید نے ان علامتوں کا استعمال کر کے ایک طرح سے پوری حیات انسانی، اس کی فطرت، اس کی خواہشات، جذبات کو بیان کر دیا ہے۔ یہ ایک علامتی افسانہ ہے۔

بظاہر اسے پڑھتے ہوئے یہ کسی داستان گو کا بیان کردہ کوئی قصہ محسوس ہوتا ہے اور قارئین کو کہیں بھی ایسا محسوس نہیں ہوتا ہے کہ وہ ایک جدید اسلوب اور نگارش میں لکھا کوئی افسانہ

پڑھ رہے ہیں بلکہ اُنہیں ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے وہ کسی داستان گو سے قصہ سن رہے ہیں یا الف لیلیٰ کا کوئی باب یا کہانی پڑھ رہے ہیں۔ اپنی لائبریری کی قدیم کتابوں میں مرزا غیاث بیگ کا آبِ حیات کے متعلق کوئی کتاب یا نقشہ کو تلاش کرنا اور پھر اس کی تلاش میں ایک پُر اسرار سفر پر تینوں کی روانگی ۔ ۔ ۔ ایک دشوار، مشکلوں اور مصیبتوں بھرا صبر آمیز سفر جس کی طوالت سے بار بار تینوں کا سفر سے اُکتا کر مایوس ہو جانا اور سفر ختم کرنے کا عزم کرنا، پھر ایک اُمید کی کرن کا نمودار ہو کر انہیں دوبارہ سفر کے لئے ایک نئے جوش سے تیار کرنا، پھر ایک نئے جوش سے سفر کا دوسرا مرحلہ اور اس مرحلہ میں بھی پھر پہلے مرحلہ کے سے واقعات اور مصائب کا سامنا کرنا، پھر نا اُمید اور پھر اس نا اُمیدی کی کیفیت سے ایک اُمید کی کرن کا دوبارہ انہیں اگلے مرحلہ کے سفر کا حوصلہ دینا، اور پھر ان کا ایک نئے جوش و ولولہ سے سفر شروع کرنا، اور پھر ان ہی مراحل سے گزر کر آخر کار منزل مقصور تک پہنچ جانا اور آبِ حیات تک پہنچ جانا اور آبِ حیات حاصل کر لینا اور اس آبِ حیات سے اپنا نصب العین ''حیات جاوداں'' حاصل کرنے کی کوشش، اور ان کی اس کوشش میں کامیابی۔

لیکن وحشی سعید نے اس افسانے کا اختتام کچھ ایسے چونکا دینے والے انداز میں کیا ہے کہ افسانہ کی آخری سطر پڑھ کر قاری نہ صرف چونک اُٹھتا ہے بلکہ بہت کچھ سوچنے پر بھی مجبور ہو جاتا ہے۔

اور اب تک قارئین جس داستان کے طلسم میں گرفتار تھا، دھیرے دھیرے اس کی پرتیں اس کے ذہن میں کھلنے لگتی ہیں۔ افسانے کے واقعات اس کے ذہن کے پردے پر تھرکنے لگتے ہیں اور افسانہ کے وہ واقعات اور چیزیں ایک نئے نور میں ڈھل کر قاری کے ذہن میں معنی کی ایک نئی قوس قزح بکھیرتے ہیں۔ تب قاری ان علامتوں اور اس افسانے کی روح کی گہرائی اور گیرائی تک پہنچ جاتا ہے۔

دراصل اس افسانے میں بیان کردہ وحشی سعید کی دونوں علامتیں ''آبِ حیات'' اور ''حیاتِ جاوداں'' اس افسانے کے تین کردار اور اُن کا تین مراحل میں طویل سفر ۔ ۔ یہ ساری علامتیں اور باتیں اصل میں زندگی کے فلسفہ کو بیان کرتی ہیں، اور اس افسانے میں وحشی سعید نے انسانی زندگی اور اس کے فلسفہ کو ان تمام علامتوں کی مدد سے بیان کیا ہے۔ آبِ حیات اور حیاتِ جاوداں بذاتِ خود زندگی کی علامتیں ہیں۔

افسانے کے تین کردار جن کا تعلق عمر کے تین مختلف حصوں سے ہے جو بچپن، جوانی اور بڑھاپے کی نمائندگی کرتے ہیں، بذاتِ خود زندگی ہے۔

تین مراحل کا دشوار گزار سفر کی علامت خود حیات یا زندگی گزارنے کے مشکل مراحل سے گزرنے کو بیان کرتا ہے۔ آب حیاب کو پالینا دراصل زندگی کا نصب العین پالینے کو ظاہر کرتا ہے، لیکن اس کو پالینے سے بھی انسان کو حیات جاوداں نہیں مل سکتی۔

افسانے کا اختتام اس سچائی اور حقیقت کو بیان کرتا ہے۔ اب علامتی افسانوں کا دور نہیں ہے۔ ممکن ہے وحشی سعید نے یہ افسانہ اُس دور میں لکھا ہوگا جب علامتی افسانہ کا دور تھا اور اس طرح کے افسانوں پر شباب تھا۔

اگر یہ افسانہ اس وقت شائع ہوتا تو اس کا شمار اس طرز کے بہترین افسانوں میں ہوتا اور اس کو جدیدیت جدید افسانہ کا نمائندہ افسانہ قرار دیا جاتا۔ لیکن آج جب افسانہ اس جنگل اور عفریت کے پنجے سے آزاد ہو چکا ہے اس لئے اس افسانہ کو وہ اہمیت حاصل نہیں ہوسکتی جو اس رویہ کے عروج کے زمانہ میں حاصل ہوسکتی تھی۔

بہر کیف پورے افسانے میں وحشی سعید نے اپنی جادوئی نثر کا مظاہرہ کر کے قارئین کی دلچسپ افسانہ میں قائم رکھی ہے۔ یہ ایک کامیاب افسانہ نگار کے فن کی بہترین مثال ہے۔



آب

’آنٹی، آپ کوتو کوئی اعتراز نہیں ہے نا میرے اور صوفی کے رشتے پر؟‘

’مجھے کیا اعتراز ہوگا بیٹا‘ جس میں میری صوفی کی خوشی، اس میں میری۔لیکن بیٹا برا نہیں مانناِ،تم نے اپنے والدین سے بات تو کرلی ہے نا؟‘

’’میں سمجھ گیا آنٹی اور مجھے خوشی ہے کہ آپ اس معاملے میں اتنی سنجیدہ ہیں‘‘

اتنا کہتے ہوئے اس نے اپنے موبائل پر گھر کا نمبر ڈائل کیا اور موبائل کا اسپیکر آن کر دیا اور اپنے منہ پر رومال رکھتے ہوئے آواز بدل کر کشمیری لہجے میں بولا۔

’’ہیلو، جی یہ کریم خان صاحب کا گھر ہے؟‘‘

’جی ہاں آپ کون؟‘

’’جی میں کشمیر سے آپ کا ایک خیر خواہ بات کر رہا ہوں۔آپ کریم خان صاحب ہی بات کر رہے ہیں نا؟‘‘

’’بالکل، فرمائیے، کیا آپ میرے بیٹے کے ہونے والے سسرال سے بات کر رہے ہیں؟‘‘

یہ سن کر صوفی اور اس کی چاچی چونک پڑے۔نسیم نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

''جی میں آپ کو یہ اطلاع دینا اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ آپ کے بیٹے پر جادو ٹونا کر کے پھنسا لیا گیا ہے، آپ کے بیٹے کی ہونے والی بیوی اور اس کی چاچی یہاں کی بہت بدنام عورتیں ہیں۔ آپ اگر اپنے گھر کی آبرو اور اپنے خاندان کا وقار بچانا چاہتے ہیں تو جلد از جلد اپنے بیٹے کو واپس بلا لیں''

''آپ کون صاحب بول رہے ہیں؟''

''جی میں لڑکی کی چاچی کا رشتہ دار بول رہا ہوں''

''لعنت ہے آپ پر۔ دو مفلس بے سہارا عورتوں جن میں میری ہونے والی بہو یتیم اور اس کی چاچی بیوہ ہے، ان کی مدد کرنے کے بجائے آپ ان پر اتنا گھٹیا الزام لگا رہے ہیں۔ خبردار! اب آپ نے میری ہونے والی بہو یا میری ہونے والی سمدھن کے بارے میں کچھ بھی بکا تو''

''آپ اتنی دور سے مجھے میرے علاقے میں دھمکا رہے ہیں یاد رکھیئے، اگر آپ کے بیٹے نے ان سے رشتہ نہیں توڑا تو وہ یہاں سے زندہ نہ جا سکے گا۔ بہتر ہے کہ آپ اسے واپس بلا لیں''

''علاقہ تو کتوں کا ہوتا ہے صاحب، اور میرا بیٹا شیر ہے۔ کتے شیر کا شکار نہیں کیا کرتے۔ اور اگر آپ جیسے کچھ کتوں نے مل کر میرے شیر بیٹے کا شکار کرنے کی کوشش کی یا پھر میری بہو اور سمدن کو کچھ نقصان پہنچانے کی کوشش کی، پھر تو یاد رکھیئے گا، میں کریم خان آپ کو زبان دیتا ہوں کہ آپ آسمان سے پار چلے جائیں یا زمین کی تہہ میں خود کو دھنسا لیں، میں آپ کو ڈھونڈ نکا لوں گا، اور پھر آپ یقین کیجیے، اپنے پیدا ہونے پر افسوس ہوگا''

نسیم نے موبائل بند کر دیا اور دونوں کی جانب دیکھا۔ صوفی کی چاچی نے بڑھ کر اس کا ماتھا چوم لیا، وہ کچھ کہنے والی ہی تھی کہ نسیم کے موبائل کی گھنٹی بجی۔

'ہیلو! جی ابو جی، السلام علیکم۔جی میں۔۔۔میں بالکل ٹھیک ہوں۔جی میں وہیں ہوں ۔اچھا۔اچھا۔دیتا ہوں۔' یہ کہتے ہوئے اس نے موبائل چاچی کی جانب بڑھا دیا۔

''ہیلو السلام علیکم۔میں صوفی کی چاچی بول رہی ہوں''

''سمدھن جی میں نسیم کا ابو کریم خان بول رہا ہوں۔آپ جلد از جلد دونوں کی شادی کی تاریخ طے کیجئے۔کسی سے گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔آپ کا اور میری بہو کا کوئی بال بھی بانکا نہیں کر سکتا، لیجئے آپ کی سمدھن یعنی نسیم کی ماں آپ سے بات کریں گی''

''ہیلو۔السلام علیکم۔سمدھن جی جلدی سے میری بہو کو لے کر میرے پاس آجائیے''

''جی۔۔جی۔۔''

پھر کچھ رسمی باتیں کرنے کے بعد چاچی نے موبائل صوفی کی جانب بڑھا دیا۔

''ہیلو! السلام علیکم امی!''

'سلامت رہو میری بچی،اب تم سے جدائی برداشت نہیں ہوتی۔جلدی سے میرے پاس آجاؤ، تاکہ میں تمہاری ساری بلائیں اپنے سر لے سکوں''

صوفی سے کچھ کہتے نہ بنا،اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔نسیم نے لپک کر موبائل لے لیا۔

'جی امی، السلام علیکم۔جی۔وہ آپ کی بات سن کر شاید خوشی سے رونے لگی۔جی امی ۔جی بہت اچھا۔'

''اچھا آنٹی اب میں چلتا ہوں،کل مجھے یہاں سے نکلنا ہے۔آپ سے کل وداع لینے آؤں گا''

''خوش رہو بیٹے۔صوفی بیٹی جاؤ۔نسیم کو سڑک تک چھوڑ کر آؤ''

'کیا بات ہے جان۔تم اداس ہو۔ارے یار تمہاری چاچی جو کہ اب میری ساس ہوں گی، اُن کو میں تم سے الگ کر کے یہاں تھوڑی چھوڑ جاؤں گا۔یہاں وہ اکیلی کس کے سہارے رہیں گی۔وہ بھی ہمارے ساتھ رہیں گی''

''یہ بات نہیں ہے۔بات یہ ہے کہ میری تقدیر سے میری خوشی نہیں دیکھی جاتی۔جب میں دس سال کی ہوئی اور اپنے خوشی غم کو محسوس کرنے لگی تو تقدیر نے ایک کار حادثے میں میرے والدین کو چھین لیا۔ان کی کار دوسری گاڑی سے ٹکرا کر دریائے جہلم کے آب میں سما گئی۔چاچا نے بڑی محبت سے پرورش کی۔جب لگنے لگا کہ اب زندگی خوش حال ہونے والی ہے تو وہ بھی میری چاچی اور مجھے روتا چھوڑ کر اس دنیا سے چلے گئے۔وہ کار چلاتے ہوئے آرام سے کشتواڑ تجارت کے سلسلے میں جا رہے تھے کہ ایک بے قابو ٹرک نے پیچھے سے کار کو ٹکر مار دی اور وہ کار سمیت دریائے چناب کے آب میں ایسے دفن ہوئے کہ لاش تک نہ مل سکی۔ان کا غائبانہ جنازہ پڑھا گیا۔مجھے اُس دن سے ایسا لگتا ہے کہ قدرت کی حسین نعمت آب ہمارا دشمن ہے۔رشتہ داروں نے ہماری جائیداد پر قبضہ کر لیا۔اب یہاں جو ہماری تھوڑی سی زمین ہے اور مزدوروں سے کاشت کاری کروا کر چاچی اپنا اور میرا پیٹ بھرتی ہے، وہ اس کے نام تھی جو بچی رہ گئی اور ہماری زندگی کا ذریعہ ہے۔اب جب پھر زندگی میں خوشیاں آنے والی ہیں، پتہ نہیں کیوں مجھے یہ ڈر لگ رہا ہے کہ تقدیر کہیں پھر ہمیں الگ نہ کر دے۔' یہ کہہ کر صوفی نہ جانے کیوں اس کے سینے سے لپٹ کر سسکنے لگی''

'اس بارے میں میں تم سے صرف اتنا کہہ سکتا ہوں جان کہ موت بھی ہم دونوں کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کر سکتی۔یہ میرا تم سے وعدہ ہے۔

اچھا دیکھو۔میں سمجھتا ہوں۔ابھی جولائی ہے۔یہاں کے اونی گارمنٹس کا آرڈر میں

نے دے دیا ہے۔ مال کی ڈلیوری لینے میں نمبر میں پھر آؤں گا، اور اسی وقت میں چاہتا ہوں کہ اپنے گھر والوں کو بھی ساتھ لاؤں اور نکاح کر کے تمہیں اور چاچی کو یہاں سے لے جاؤں۔ کیوں کہ اس کے بعد ہمارا جاڑے کا سیزن شروع ہو جائے گا اور پاپی پیٹ کے لئے مجھے ملک کے مختلف حصوں کے ساتھ ساتھ بیرونی ممالک کا چکر بھی لگانا پڑے گا۔ تم تو جانتی ہو، تمہارے ہونے والے سسر اور تمہارا ہونے والا خاوند چھوٹے موٹے تاجر ہیں جو پاپی پیٹ کے لئے ادھر ادھر بھٹکتے رہتے ہیں"

"میں نے تو آپ کو ابھی سے اپنا سرتاج مان لیا ہے میرے جسم و جان کے مالک۔ آپکا حکم اور میرا سر"

'نہیں میری زندگی۔ تمہارا سر اور میرا سینہ، میری آغوش' یہ کہہ کر اس نے صوفی کو اپنے سینے سے چمٹا لیا۔ سڑک آ گئی تھی۔ آنکھوں میں لاکھوں خواب لئے ہوئے وہ دونوں ایک دوسرے سے جدا ہوئے۔

ستمبر میں نسیم شادی کی تیاریاں کر ہی رہا تھا کہ سیلاب آ گیا۔ وادی زبردست تباہی کی زد میں آ گئی۔ صوفی کی بستی کو سیلاب کا آب اپنے ساتھ بہا لے گیا تھا۔ کافی دنوں تک ان کا کوئی پتہ نہ چل سکا۔ سردیاں اپنے شباب پر تھیں۔ نسیم لندن میں تھا کہ ایک دن اس کے والد کا فون آیا کہ صوفی اور اس کی چاچی خیریت سے ایک سرکاری ٹنینٹ میں ہیں۔ اس نمبر پر تم ان سے بات کر لو۔ والد کے دئے ہوئے نمبر پر اس نے فون کیا۔

"دیکھا میرے سرتاج میں نے کہا تھا نہ کہ آب ہمارا دشمن ہے"

'میری جان، میں نے بھی تو کہا تھا نا کہ موت بھی ہمیں جدا نہیں کر سکتی۔ میں لندن کا کام جلد از جلد ختم کر کے تمہارے پاس آ رہا ہوں"

"نہیں آپ آرام سے اپنا کام ختم کیجئے۔ ہم یہاں آرام سے ہیں۔ آپ اپنے پروگرام کے مطابق گرمی میں آئیے گا"

وقت گزرتا گیا۔ اپنے پروگرام کے مطابق نسیم بہار کے موسم میں وادی آیا۔ صوفی کی بستی کے سارے پکے مکانوں کی جگہ اب ٹین شیڈ والے مکانوں نے لے لی تھی۔ مزدور کھیتوں میں کاشت کاری کا کام انجام دے رہے تھے۔

'چاچی، آپ لوگ میرے ساتھ چلیئے۔ نکاح وغیرہ کی جو بھی رسم ہے، اب وہیں ادا ہوگی"

"تمہاری محبت سر آنکھوں پر۔ لیکن ہماری بھی کچھ تہذیب ہے، ارمان ہیں۔ اس سال اور رُک جاؤ۔ فصل بہت اچھی ہونے کے امکان ہیں۔ کچھ پیسے آجائیں گے تو عزت و آبرو سے بیٹی کی رخصتی کے ساتھ اپنی بھی رخصتی ہو جائے گی۔ بیٹا، خدا تمہیں اور نوازے۔ تمہارے پاس کسی قسم کی کوئی کمی نہیں۔ لیکن بیٹا جو ہمارا سماج ہے، ہماری تہذیب ہے، اس کا بھی تو کچھ حق ہم پر بنتا ہے"

نسیم کچھ نہ کہہ سکا۔ طے یہ پایا کہ اگلی عید کے ساتویں روز بارات آئے گی اور پھر سب ساتھ ہی نسیم کے گھر آجائیں گے۔

لیکن عید کے تیسرے دن سے ہی وادی کے حالات بگڑ گئے۔ پتھر بازی، فائرنگ۔ اس بار بھی سب سے زیادہ متاثر صوفی کا ہی علاقہ تھا، کیوں کہ حالات اس کے علاقے سے ہی مزید کشیدگی اختیار کر گئے تھے۔ کچھ دن تو لگا کہ سب کچھ جلد ہی ٹھیک ہو جائے گا، لیکن جب دو ہفتے سے زیادہ کا وقت گزر گیا تو نسیم برداشت نہ کر سکا اور کسی صورت پتھر اور فائرنگ سے بچتے بچاتے اپنی محبت تک پہنچ گیا۔

'آپ کو ایسے وقت میں اپنی جان پر کھیل کر یہاں نہیں آنا چاہئے تھا''

'اپنی جان کے پاس ہی تو آیا ہوں۔ چلو جیسے ہی مناسب موقع ملے یہاں سے نکل چلتے ہیں، اگر اسی طرح ہماری شادی رکتی رہی تو ہمارا بڑھاپا آ جائے گا اور شادی نہ ہو سکے گی۔ کیوں چاچی آپ کیا کہتی ہیں؟'

صوفی کا چہرہ شرم سے لال ہو گیا۔ چاچی نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

'ٹھیک ہے بیٹا۔ یہاں کے حالات ایسے ہو گئے ہیں کہ عزت آبرو کا خطرہ بھی محسوس ہونے لگا ہے تمہاری امانت تمہیں جتنی جلد سونپ دی جائے، میں اتنی جلد اپنے فرض سے دست بردار ہو جاؤں۔ تم صوفی کو لے کر یہاں سے چلے جاؤ۔ میں بعد میں تمہارے یہاں آ جاؤں گی۔ ان حالات میں سب کا گھر چھوڑ کر جانا بھی مناسب نہیں ہے۔ سماج۔۔۔۔۔'

'پھر سماج۔' نسیم اس کی بات کاٹ کر بولا۔ 'خیر جیسی آپ کی مرضی۔'

ایک دن آدھی رات کے بعد دونوں ایک گاڑی میں سوار ہو کر ائر پورٹ کے لئے نکلے۔ ابھی آدھے راستے ہی پہنچے تھے کہ رات کے احتجاجی جلوس نے ان کا راستہ روک لیا۔ انھیں واپس جانے کا حکم ہوا۔ کچھ دور واپس آ کر انھوں نے گاڑی جنگل کے کنارے جھاڑیوں میں چھپا دی۔ جلوس کے دور جانے کا انتظار کرنے لگے۔ ان سب میں خاصا وقت صرف ہو گیا۔ جب فجر کی اذان ہوئی تو انھوں نے اپنا سفر شروع کیا۔ آدھا گھنٹہ بعد صبح کی روشنی پھیلنے لگی۔ کچھ ہی دیر بعد جب وہ دریائے جہلم پر بنے ہوئے ایک پل کے پاس پہنچے، سڑک کے کنارے چھپے ہوئے کچھ لوگ یکا یک نکل آئے اور ان کا راستہ روک لیا۔ ان کی گاڑی جلا دی گئی اور واپس جانے کا حکم دیا گیا۔ نسیم نے احتجاج کیا تو لوگ مشتعل ہو کر نعرہ بازی کرنے لگے۔ اتنے میں آسمان میں شعلہ اٹھتا دیکھ پولیس وہاں آ گئی۔ پولیس کو آتا دیکھ کر نسیم صوفی کا ہاتھ پکڑ کر ان کی جانب دوڑا۔ اسی دوران

بھیڑ نے پتھراؤ شروع کر دیا۔ ادھر پولیس نے بھی مورچہ سنبھال لیا۔ ان کے درمیان نسیم اور صوفی دریائے جہلم کے کنارے ایک دوسرے سے لپٹے ہوئے خوف زدہ کھڑے تھے۔ صوفی غور سے جہلم کے پانی کو دیکھ رہی تھی۔ یکا یک صوفی بول پڑی ۔ ۔ ۔

'میں نے کہا تھا نا کہ آب ہمارا دشمن ہے''

نسیم نے اسے مزید مضبوطی سے پکڑتے ہوئے کہا۔

'میں نے بھی تو کہا تھا نا کہ موت بھی ہمیں جدا نہ کر سکے گی''

اسی وقت پتہ نہیں کدھر سے گولی باری شروع ہو گئی اور دو گولیاں نسیم کے جسم میں سما گئیں۔ اس سے پہلے کہ صوفی کہ منہ سے چیخ نکل پاتی، کہیں سے ایک پٹرول بم آ کر صوفی کے سر سے ٹکرایا اور وہ دیکھتے ہی دیکھتے شعلہ بن گئی۔ نسیم نے جلتی صوفی کو گود میں اٹھایا اور دریائے جہلم میں کود گیا۔ دوسرے دن یہ خبر جلی حروف میں اخبار کے پہلے صفحہ پر درج تھی۔

''دریائے جہلم سے دو لاشیں برآمد۔ دونوں کی شادی ہونے والی تھی۔ لڑکے کے جسم میں دو گولیاں لگی تھیں اور لڑکی کا جسم بری طرح جھلسا ہوا تھا۔ دونوں کے جسم آپس میں چمٹ کر اس جہلم کے سرد پانی میں اس قدر اکڑ گئے تھے کہ انھیں لاکھ کوششوں کے باوجود الگ نہ کیا جا سکا، اس لئے ان دونوں کو ایک ہی قبر میں دفنایا گیا''

صوفی کی چاچی ان دونوں کی ایک ہی قبر پر کھڑی ہو کر سوچ رہی تھی کہ قدرت نے صوفی کے قول کو کہ دریا کا پانی اُس کے گھر کا دشمن ہے اور نسیم کے قول کہ موت بھی ان دونوں کو جدا نہ کر سکتی ہے، کو پورا کر دیا ہے۔



غلام نبی کمار

وحشی سعید کی کہانی 'آب' کا تجزیہ

وحشی کی افسانوی سعادت

وحشی سعید نے اپنے نام کی وضاحت میں جو معنی خیزی دکھائی، وہی معنی خیزی ان کی افسانوی سعادت مندی قرار پاتی ہے اور لفظِ ''وحشت'' فقط ''وحشت'' نہ رہ کر ''سیمابیت'' کی سرحد میں داخل ہوجاتا ہے اور یہی سیمابیت وحشی سعید کے یہاں زندگی کی علامت ہے۔ فعالیت وتحریک کا اشاریہ ہے۔ گویا اس طرح دیکھیں تو ان کا افسانہ ''آب'' ہو یا کہ دیگر افسانے، تخلیقی اُبال، سیمابی آنچ، مضطربانہ طمطراق اور فنکارانہ اطوار سے آب دار نظر آتے ہیں۔ کسی بھی فردِ بشر کے نام کا لاحقہ یا سابقہ ''سیمابیت'' ہوجائے تو عموماً اس کی طرف ترچھی نظر اٹھنے لگتی ہے، اسی طرح کسی بھی فنکار کے ساتھ ''زودنویسی'' کا لاحقہ جڑ جائے تو اس سے دوری بنانے کی فضا سازی ہونے لگتی ہے۔ ناقدینِ ایسے تخلیق کاروں سے متنفر ہونے لگتے ہیں، لیکن ناقدوں اور ادب کے پارکھوں کی یہ کج فہمی اور ناعاقبت اندیشی ہے کہ وہ ''سیمابیت'' سے خوف کھاتے ہیں اور ''زودنویسی'' کے لفظ سے فی الفور بِدکنے لگتے ہیں۔ کیوں کہ سیمابیت دراصل انسانی زندگی کی رنگارنگی ہے۔ جیسا کہ وحشی سعید نے اپنے سے جڑے ہوئے لفظ ''سیمابیت'' کی وضاحت کی۔ تغیراتِ زمانہ جس طرح ایک حقیقت ہے، اسی طرح انسانی مزاج اور اطوار کی تبدیلی بھی بدیہی حقیقت ہے۔

اسی بدیہی حقیقت سے افسانوی کائنات میں رشتہ استوار رکھنا عقلمندی کی بات ہوتی ہے، نہ کہ بدذوقی کی۔ وحشی سعید نے زندگی کی رنگارنگی کو سیمابیت کے پس منظر میں دیکھنے کی اپیل کی ہے، جو کہ ایک قرینِ عقل بات ہے۔ اب رہی بات زودنویسی کی تو اس کے متعلق جوگندر پال نے بڑی خوبصورت بات کہی ہے کہ جلدی سے سامنے آجانے والے ادب پارہ کو لوگ بہت آسانی سے دیکھ لیتے ہیں، لیکن اس ادب کو معرض وجود میں لانے کے لیے کتنی دل سوزی کرنی پڑی، ذہن ودماغ کو کس حد تک مصروف رکھنا پڑا، تخیلاتی معاملات سے کس قدر سروکار رہا، اس پر کسی کی نگاہ نہیں جاتی ہے۔ ادب پارہ کے معرض وجود میں لانے کے لئے جن مراحل سے گزرنا پڑتا ہے اگر اُن پر توجہ کرلی جائے تو قطعاً زودنویسوں سے بدکنے کی نوبت نہیں آئے گی۔ گویا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ سیمابیت کو وحشی سعید نے انتہائی دلکش پیرائے میں متعارف کروایا اور جوگندر پال نے زودنویسی کو۔ رہی بات وحشی کے تخلیقی رویوں کی تو ان کے یہاں سیمابیت بمعنی زندگی کی رنگارنگی اور رعنائی تو ہے زودنویسی نہیں، لیکن وحشی سعید نے ایک بڑے بزنس مین ہونے کے باوجود بھی جو وقت نکالا اور پھر ایک عبوری دور (جو تقریباً دو دہائیوں پر محیط ہے) میں ادب سے ترکِ تعلق رکھا، اس کے باوجود انھوں نے تقریباً سو کہانیاں اور تین ناول لکھے، جو اس بات کی دلیل ہے کہ وحشی کے اندر تخلیق کی فطری صلاحیت موجود ہے۔ ساتھ ہی ساتھ فی الفور کسی بھی معاملہ کے تجزیے کی ہنرمندی سے وہ مالا مال ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے مصروف ترین زندگی میں سے لمحات جمع کر کے شاہکار ادبی چیزیں پیش کیں ہیں۔

اوپر پیش کیے گئے عمومی چند جملوں کے تناظر میں وحشی کے مذکورہ افسانہ ''آب'' کا جائزہ لیا جائے تو نظر آئے گا کہ انھوں نے متنوع خصوصیات کے اس افسانہ کو آب دار بنانے کی کوشش کی ہے۔ اس کی بنت میں فنکاری یہ نظر آتی ہے کہ انھوں نے کشمیر کے پس منظر میں ڈوبی اس تخلیق میں جہاں نفسیاتی الجھنوں کو شامل کردیا ہے۔ وہیں نوجوانوں کے المیہ، تغیراتِ حیات

اور لمحات کی نازکیوں کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ کسی ایک کہانی کی بنت میں ان باتوں کا تنظیمی سطح پر خیال رکھنا کوئی آسان کام نہیں ہے، بلکہ اندیشہ یہ ہوتا ہے کہ ان جزئیات پر توجہ کرتے کرتے کہیں کہانی ہاتھ سے نہ نکل جائے، مگر ''آب'' میں موضوعاتی حسیت، جزئیات کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ اس کے باوجود بھی یہ کہانی نہ بوجھل ہوتی ہے اور نہ دائرۂ افسانہ سے باہر نکلتی ہے۔ کیوں کہ افسانہ نگار نے افسانہ بُنتے وقت اصل مسئلہ کشمیری تناظرات کو نظر سے اوجھل نہیں ہونے دیا ہے۔ اس کہانی کا یہ معاملہ بھی اپنی طرف ملتفت کرتا ہے کہ کشمیر کے حالات میں بے شمار کہانیاں لکھی گئیں اور یہاں تک کہ وحشی سعید نے بھی کئی ایک قابل ذکر کہانیاں دیں، اس کے باوجود ''آب'' کی جدت الگ ہے۔ وہ اس طرح کہ انھوں نے اس کہانی میں نہ بے جا کشمیر کے فطری مناظر کو ابھارا ہے اور نہ ہی وہاں کی خطرناکیوں کا حد سے زیادہ ذکر کیا ہے۔ اگر وہ چاہتے تو طوالت کے ساتھ وہاں کے نشیب وفراز کا ذکر کر سکتے تھے۔ افسانے میں قرأت کی دل چسپی بڑھانے کے لیے زیبِ داستان کا رویہ اپنا سکتے تھے، مگر انھوں نے بڑی فنکاری سے ''آب'' کی نسوانی مرکزی کردار ''صوفی'' کی زبان سے چند جملے ادا کروائے، جو کشمیر کے ابتر حالات کو واضح کرتے ہیں اور ساتھ ہی کہانی محبت کے احساس میں ڈوب کر بھی کشمیر کے حالات کی سنجیدگی کو ہمارے سامنے اوجھل نہیں ہونے دیتی ہے۔ مثلاً:

''دیکھا سرتاج میں نے کہا تھا نا کہ آب ہمارا دشمن ہے''

یہ جملہ گرچہ چھوٹا ہے مگر معنی خیز ہے۔ کیوں کہ اس کے معرض وجود میں آتے ہی یہ اندازہ ہوتا ہے کہ صوفی نے نسیم سے آب کے پلاٹ سے متعلق کوئی نہ کوئی جملہ پہلے بھی کہا ہے۔ گویا ''آب'' کا معاملہ نہ صرف حالات کی ابتری کی طرف مشیر ہے، بلکہ نفسیاتی الجھنوں کی نشاندہی کر رہا ہے اور صوفیہ کے لاشعور میں آب سے جڑے معاملات یعنی نفسیاتی پیچیدگیاں پیدا کر رہا ہے۔ اس لیے ہمیں کہنا پڑتا ہے کہ وحشی سعید نے کشمیر کے حالات کو بین اور آہ وبکا کے ساتھ پیش

نہیں کیا بلکہ افسانہ بنتے وقت اس حقیقت کو سامنے رکھا ہے کہ 'افسانہ چھپانے کا فن ہے'۔ یہی وجہ ہے کہ چھپتے اور واضح ہوتے ہوتے یہ افسانہ کشمیر کے نامساعد حالات کے ساتھ رودادِ محبت بھی سناتا ہے۔ ایک ایسی محبت جس میں حصولِ محبوب کے لیے جانفشانی بھی ہے، مگر نتیجہ ایسا دردناک جو کشمیری حالات کا لازمہ بنتا ہوا نظر آتا ہے۔ یہ بھی سچ ہے کہ کشمیر کے حالات میں خواب سنجوتے سنجوتے زندگی میں ایسا موڑ آجاتا ہے، جو آفتِ ناگہانی سے ٹکرانے پر مجبور کردیتا ہے۔ وحشی سعید نے اس کہانی میں ڈھکے چھپے لفظوں میں جو کہانی سنائی ہے، ''آب'' کہانی کی تفہیم اور تجزیہ سے لطف اندوز ہونے کے لیے ضروری ہے کہ ہم اس کا خلاصہ پیش کریں۔

مختصر یہ کہ نسیم نامی لڑکا صوفی کی زلف گرہ گیر کا اسیر ہے۔ لڑکی نہ صرف یتیم، بلکہ اس کے گھر کا سہارا کوئی مرد تک نہیں۔ اس کا پورا کنبہ ایک چاچی اور بھتیجی (صوفی) پر مشتمل ہے۔ نسیم نے جذباتی سطح پر صوفی کو اپنانے کے متعلق اس کی چاچی سے بات کی۔ اس کے بعد اپنی آواز تبدیل کر کے وہ فون پر اپنے والد سے بات کرتا ہے کہ میں صوفی کا رشتہ دار یعنی چچا ہوں۔ تمہارا بیٹا نسیم میری بھتیجی صوفی سے شادی کرنے پر تلا ہے (حالانکہ یہ نسیم ہی ہے جو آواز بدل کر اپنے والد سے بات کرر ہا ہے)۔ قوی امکان تھا کہ نسیم کے والد کریم خان بیٹے کی حرکت سے آگ بگولہ ہوجاتے۔ حد درجہ ناراض ہوتے، مگر انھوں نے صوفی کے چچا کو ڈانٹتے ہوئے کہا کہ 'لعنت ہے آپ پر۔ دو مفلس بے سہارا عورتوں جن میں میری ہونے والی بہو یتیم اور اس کی چاچی بیوہ ہے، ان کی مدد کرنے کے بجائے آپ ان پر اتنا گھٹیا الزام لگا رہے ہیں......' گویا اس طرح نسیم کے والد کریم خان نے اپنے بیٹے کی شادی کی راہ ہموار کردی۔ والد کی رضامندی کے بعد صوفی اور نسیم کے درمیان قربتیں بڑھنے لگیں۔ صوفی اور اس کی چاچی سوچتی تھیں کہ شادی جو کل ہو، آج ہی ہوجائے۔ مگر حالات بدلتے رہے۔ تجارت کے تعلق سے نسیم لندن بھی گیا۔ کشمیر کے معاملات بدلتے رہے۔ بالآخر صوفی اور نسیم رشتہ ازدواج میں بندھ نہ سکے۔

'آب' کی کل اتنی سی کہانی ہے، جسے پڑھ کر ہم آسانی سے گزر سکتے ہیں، مگر جب گہرائی میں جائیں گے تو اس کے کئی ایک پہلو سامنے آسکتے ہیں، جنھیں سلسلہ وار ذیل کی سطور میں بیان کیا جائے گا۔

اول: نسیم آواز تبدیل کر کے اپنے والد سے بات چیت کرتا ہے۔ ان کے جذبات کو ابھارتا ہے اور شادی کے لیے تیار بھی کر لیتا ہے۔ اس عمل میں جہاں مشرقی روایات اور رسومات کا عمل دخل نظر آتا ہے، وہیں یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ نوجوانوں میں پسند کی شادی کا جذبہ زیادہ پایا جاتا ہے۔ اس کے باوجود آج ہندوستانی فضا میں والدین سے باغیانہ تیور کی شمولیت بڑی تیزی سے نہیں ہو رہی ہے۔ اگر نسیم چاہتا تو صوفی سے فی الفور شادی کر لیتا۔ اپنے والدین سے بات چیت نہیں کرتا، مگر نسیم نے اپنے والدین کو قائل کرنے کے بعد شادی کا فیصلہ کیا۔ گویا یہ عمل اس بات کی دلیل ہے کہ نوجوان روشن خیال ہونے کے باوجود بھی مشرقیت کو سینے سے لگائے ہوئے ہیں۔

دوم: دوسری بات یہ ہے کہ نوجوان آج اپنی خواہشوں کو پوری کرنے کے لیے بے شمار ذرائع استعمال کر رہے ہیں، جن میں سے کچھ قابل تحسین بھی اور کچھ قابل مواخذہ بھی۔ مگر نسیم نے ایک ایسا طریقہ اختیار کیا جو قابل مواخذہ نہیں، قابلِ تحسین ہے۔ نسیم کے اس رویہ سے یہ بھی اندازہ ہو رہا ہے کہ نئی نسل اپنے مفاد میں نئے نئے آلات اور ایجادات کا استعمال مثبت زاویہ سے بھی کر رہی ہے۔

سوم: اس کہانی کا یہ پہلو بھی قابل قدر ہے کہ نسیم کے والدین فون پر اپنے بیٹے کے متعلق معاملات پر جھنجھلائے نہیں بلکہ اس کی صوفی سے شادی پر رضامندی کا اظہار کیا ہے۔ اس میں دو پہلو نظر آتے ہیں۔ ایک یہ کہ آج کے والدین اپنے بچوں کی نیک خواہشات کی قدر کرنے لگے ہیں۔ گویا وحشی سعید نے یہ بھی پیغام دیا ہے کہ موجودہ نسل کے والدین کو اپنے بچوں کی نیک خواہشات کا اچھی طرح خیال رکھنا چاہیے، تا کہ نہ بچوں کی زندگی اجیرن ہو اور نہ ہی والدین کی۔ نسیم کے

والدین کی رضامندی میں سب سے اہم اور قابل التفات مسئلہ یہ ہے کہ وہ ایک یتیم بچی کو بآسانی قبول کر رہے ہیں۔ ایک دبے کچلے گھرانے میں شادی کے لئے فی الفور تیار ہو گئے۔ یہاں بھی وحشی سعید نے سماج کی اس ذہنیت پر طنز کیا، جو دبے کچلے گھرانوں سے متنفر رہتی ہے۔ انھوں نے ایک بڑے گھرانے کو صوفی کی غربت کے سامنے لا کھڑا کر دیا ہے۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آج بھی سماج میں انسانی ہمدردی کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔

چہارم: کشمیر کی ابتری کچھ ایسی ہے کہ انسان حالات کے اشاروں پر ناچتا رہتا ہے۔ وہاں کے حالات میں نہ نوجوانوں کی خواہشات کی تکمیل بڑی آسانی سے ہو سکتی ہے اور نہ غربت کے مارے وہاں کے پر خطر معاملات سے بچ سکتے ہیں۔

پنجم: اس کہانی کا نفسیاتی پہلو مسئلہ آب میں چھپا ہوا ہے۔ وہ اس طرح کہ صوفی کے والد کا انتقال دریائے چناب میں غرق ہو جانے سے ہوا تھا۔ صوفی کے ذہن پر نفسیاتی طور پر ہمیشہ یہ سوار رہتا تھا کہ کہیں آب کی وجہ سے نسیم اور میری زندگی تباہ نہ ہو جائے۔ تخلیق کار نے صوفی کی اس نفسیاتی پیچیدگی کو کئی جگہ واضح کیا ہے۔ جب وہ سیلاب کا ذکر کرتے ہیں تو بھی صوفی کی یہی نفسیاتی پیچیدگی واضح ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ کہانی کا اختتام بھی بیحد چونکانے والا ہے۔ کیوں کہ نسیم اور صوفی کے یکجا نہ ہو پانے میں آب کا ہی کردار رہا ہے:

”دریائے جہلم سے دو لاشیں برآمد۔ دونوں کی شادی ہونے والی تھی۔ لڑکے کے جسم میں دو گولیاں لگی تھیں اور لڑکی کا جسم بری طرح جھلسا ہوا تھا۔ دونوں کے جسم آپس میں چمٹ کر اس جہلم کے سرد پانی میں اس قدر اکڑ گئے تھے کہ انھیں لاکھ کوششوں کے باوجود الگ نہ کیا جا سکا“

ان چند جملوں میں تخلیق کار نے بڑی فنکاری سے عشقیہ لے میں فنائیت کے جذبہ کو ابھارا ہے کہ صوفی اور نسیم جیتے جی یکجا نہیں ہو پائے، مگر موت کی آغوش میں جا کر دونوں اس قدر چمٹ گئے کہ

کوئی بھی انھیں الگ نہیں کر سکا۔ اردو کی کئی قابل ذکر مثنویوں میں بھی عشقیہ ایسی جھلک نظر آتی ہے کہ معشوق اور معشوقہ جیتے جی ایک نہ ہو سکے، مگر حالات ایسے ہو گئے کہ انھیں ایک ہی قبر میں دفنا نا پڑا۔ وحشی سعید نے اس منظر کو پیش کر کے جہاں یہ پیغام دیا کہ بے مروتی کے دور میں بھی عشقیہ جذبات قابل قدر ہیں۔ کہانی کے اختتام میں اس پہلو کے ساتھ ساتھ تخلیق کار نے یہ بھی دکھا دیا کہ کشمیر کے حالات میں اپنے آپ کو اپنا بنائے رکھنا بہت مشکل ہے۔ کیوں کہ ایک طرف انھیں گولیوں سے بھون دیا گیا، دوسری طرف دریائے جہلم کی نذر کر دیا گیا۔ گویا اس طرح دیکھیں تو صوفی میں آب کے تناظر میں خوف کی جو نفسیات تھی، وہی نسیم اور صوفی کی موت کا باعث بنی۔ یعنی نفسیاتی نہج کی کارفرمائی اس کہانی میں بھی نظر آتی ہے۔

ششم: ان پہلوؤں کے علاوہ اس کہانی کا یہ پہلو بھی قابل التفات ہے کہ ''آب'' علامت ہے یا پھر واقعی ''آب''، ''آب'' ہی ہے۔ ہم یہ وضاحت کرتے چلیں کہ کشمیری افسانہ نگاروں میں وحشی سعید کی شناخت علامتی افسانہ نگار کی حیثیت سے بڑی اہم ہے۔ ان کی ایک قابل ذکر کہانی ''آبِ حیات'' بھی ہے، جو کہ علامتی ہے۔ اب رہی بات یہ کہ پیش نظر کہانی ''آب'' علامتی ہے کہ نہیں؟ اس سوال پر راقم دو باتیں کہہ سکتا ہے۔ اول یہ کہ یہ کہانی علامتی بھی ہو سکتی ہے اور سادہ بیانیہ کی عمدہ مثال بھی۔ سادہ بیانیہ کی مثال اس طرح ہے کہ ''آب'' کی خطرناکی پیش آئی۔ دریائے جہلم اور دریائے چناب سے ملنے والی لاشیں اس بات کی اشاریہ ہیں کہ آب سے کشمیر میں نقصانات ہوتے رہتے ہیں۔ جیسا کہ صوفی کے والد اور خود صوفی اور اس کے ہونے والے شوہر نسیم کی موت ہوئی، لیکن دوسرے تناظر میں آب کو ہم علامت بھی مان سکتے ہیں۔ اس کی توجیہہ یہ ہوگی کہ خطرناک دریا کی طرح، کشمیر کے مکمل حالات آب کے مانند ہو گئے ہیں۔ گویا وہاں دریا ایک خطرناک صورت حال اختیار کر رہا ہے، وہیں دوسری طرف وہاں کے حالات خطرناک بن گئے، جو دریا سے زیادہ خطرناک ہوتے چلے جا رہے ہیں، ویسے یہ کہانی سادہ بیانیہ کی عمدہ مثال ہے۔

موضوعاتی تناظرات کے بعد اگر اس افسانہ کی فنی خصوصیات پر گفتگو کی جائے تو معلوم ہوگا کہ وحشی سعید کو زبان و بیان پر قدرت حاصل ہے، ساتھ ہی ساتھ انھیں یہ بھی معلوم ہے کہ سادگی کے بطن سے ہی پرکاری کی پیدائش ہوتی ہے۔ بیجا لفظی الٹ پھیر اور کہانی کو متعدد مقامات پر کلائمکس سے جوڑنے سے کہانی کی سادگی جاتی رہتی ہے اور تصنع کا احساس ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وحشی سعید نے انتہائی صاف لب ولہجہ میں ایک ایسی کہانی تخلیق کی جو متوازی طور پر متعدد مسائل کو مس کرتے ہوئے اختتام کو پہنچتی ہے۔ ان کی یہ کہانی تہہ دار ہے، اکہری نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی جزئیات کی روشنی میں ہم بیک وقت کئی پہلوؤں سے ہمکنار ہوتے ہیں۔ افسانوں کی تہہ داری اس وقت قابل التفات نہیں ہوتی ہے، جب افسانہ ارتکاز کے ساتھ کسی ایک نکتہ پر نہ پہنچائے۔ درمیان میں جس طرح بھٹکتا رہے، اسی طرح اختتام میں بھی بکھرا رہے۔ وحشی کی یہ چھوٹی سی کہانی درمیان میں ادھر ادھر بھٹکتی ہے۔ مختلف حالات پیش کرتی ہے۔ یہاں تک کہ ڈرامائی فضا بھی پیدا کرتی ہے، مگر اختتام کے چند جملوں میں درمیانی بکھراؤ سمٹ جاتا ہے۔ اس لیے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ وحشی سعید مسائل کے تجزیوں کے ساتھ ساتھ مسائل کے بکھراؤ کو جوڑنے کی ہنرمندی سے مالا مال ہے۔ لب لباب کے طور پر یہ کہنا بجا ہوگا کہ یہ کہانی دوہرے بیانیہ کی عمدہ مثال ہے۔ ڈرامائی کیفیت سے مالا مال ہوکر عشق وشوریدگی کی نئی مثال پیش کرتی ہے۔ علامت اور سادہ بیانیہ کی کڑیوں کو انتہائی حسن آمیز فضا میں جوڑتی ہے اور کہانی پھیلتے پھیلتے ایک نکتہ پر آکر سکڑ جاتی ہے۔



جنون

اندھیرا پھیل گیا تھا۔ لال چوک کی دوکانیں بند ہو رہی تھیں۔ میں اپنی دُھن میں گم گھر کی طرف جا رہا تھا۔ راستے میں کئی حسین لڑکیاں اپنے والدین اور دیگر رشتہ داروں کے ہمراہ اپنے مقام کی طرف روانہ تھیں۔ خوبصورت اور مدہوش کر دینے والی لڑکیاں، جوانی کے خون کو گرما دینے والی لڑکیاں۔ مجھے اپنے دوست سلطان کا جملہ یاد آ گیا ۔ ۔ ۔

''یار گوپال! تم پہلوانی والا دلکش بدن رکھتے ہو۔ لیکن سچ بتاؤں تمہارا جینا تب تک بے کار ہے جب تک تمہاری اس بائیس سالہ زندگی میں کوئی حسین پری نہیں آ جاتی''

''اب زبردستی پری کہاں سے لاؤں یار۔ کوئی دل کو بھا جانے والی ایسی لڑکی ہو جو دو باتیں کرے، جبھی تو میں اس سے پیار کا اظہار کروں۔ یہاں تو پہلوانی کے علاوہ کبھی کسی لڑکی سے دو باتیں کرنے کا موقعہ ہی نصیب نہیں ہوا''

''ارے بیوقوف موقعہ ملتا نہیں، نکالا جاتا ہے''

''یار موقعہ نکالنے کا موقعہ بھی اب تک نصیب نہیں ہوا''

دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز نے میرے خیالوں کو منتشر کر دیا۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ سمجھ پاتا، ایک خوبصورت لڑکی پیچھے سے مجھ سے ٹکرائی اور میرے بازوؤں کو تھامتے ہوئے میرے پیروں پر گر پڑی۔

''مجھے اس سے بچائیے۔ وہ مجھ پر جھوٹا الزام ۔ ۔ ۔'' یہ کہہ کر وہ زار و قطار رونے لگی۔ اس کے پیچھے ہی ایک آدمی دوڑتا ہوا آیا اور مجھے دیکھ کر رُک گیا۔ مجھے لگا کہ کوئی فلم کا سین ہے جس

میں ہیروئن ولن سے بچنے کے لئے ہیرو سے مدد مانگ رہی ہے۔اس آدمی نے مجھے ایک گہری نظر سے دیکھا اور پہچانتے ہوئے بولا ۔ ۔ ۔

''ارے جناب آپ ۔ ۔؟''

مجھے یاد آیا کہ دس دن قبل میں نے اسے دنگل میں ہرایا تھا۔

''کیا بات ہے؟''

''یہ عورت میری دوکان سے سونے کی بالی چرا کر بھاگی ہے۔کئی سارے زیور دیکھنے کے بعد جب کاؤنٹر پر زیورا کٹھا ہو گئے ،اس نے موقعے کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے کان کی بالی اپنے پرس میں ڈال لی''

''یہ جھوٹ بولتا ہے اور سب سے بڑی بات یہ کہ میں عورت نہیں لڑکی ہوں'' ۔ ۔ آخر کے لفظ اس نے قدرے خفگی سے ادا کیے۔

''جناب اگر یہ سچ بولتی ہے تو اس کے پرس کی تلاشی لے لیجئے۔اگر اس میں سے بالی نہیں نکلی تو میں چلا جاؤں گا''

''اس کا مطلب ہے کہ تم خود بھی "Sure" نہیں ہو کہ اس نے بالی چرائی کہ نہیں۔کسی شریف لڑکی کے پرس کی تلاشی صرف شک کی بنیاد پر لینا اس کی کتنی بڑی بے عزتی ہے جانتے ہو۔اگر بالی ان کے پرس سے نکل گئی تو میں خود انہیں تمہارے ساتھ چل کر پولیس کے حوالے کر دوں گا۔لیکن اگر نہیں نکلی تو؟ کیا تم نے بالی اپنے کاؤنٹر کے نیچے ڈھونڈی؟ ممکن ہے وہ زیورات کے ڈھیر میں نیچے گر گئی ہو۔کیا تم نے اسے کاؤنٹر کے نیچے فرش پر غور سے دیکھا؟'' ۔ ۔ میرا دماغ کسی جاسوس کے دماغ کی طرح کام کر رہا تھا۔

وہ خاموش ہو گیا۔

''لیکن ۔ ۔ ۔''

''لیکن ویکن کچھ نہیں۔اگر ان کے پرس سے بالی نہیں نکلی تو میں تمہیں پہلے تو یہاں بری طرح

پیٹوں گا۔ پھر گھسیٹتے ہوئے پولیس تھانے لے جاؤں گا۔ بولو منظور ہے؟''

وہ ہکا بکا رہ گیا۔ پھر سر کھجاتے ہوئے بولا ۔ ۔ ۔

''شاید آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ بالی کاؤنٹر کے نیچے ہی گری ہوگی'' ۔ ۔ یہ کہتے ہوئے وہ وہاں سے چلا گیا۔

''آپ کا بہت بہت شکریہ۔ آپ نے میری عزت رکھ لی، ورنہ یہ دنیا تو سچائی کو مانتی ہی نہیں''

''مانتی ہے۔ آخر میں نے مانا نا آپ کی سچائی کو''

''وہ تو اُس نے آپ سے ڈر کر مانا۔ اور آپ کی سچائی میں کہیں نہ کہیں نسوانیت سے ہمدردی چھپی تھی۔ اگر میری جگہ کوئی مرد ہوتا تو شاید آپ کا عمل کچھ اور ہوتا''

میں اس کی ذہانت پر حیران تھا۔

''آپ کا مطلب ہے دنیا میں سچائی باقی نہیں ہے''

''میرا مطلب ہے دنیا میں سچ بولنے والے لوگ بہت دنوں تک باقی نہیں رہتے۔ بہر حال آپ نے میری مدد کی ہے۔ میں آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں۔ آپ کا نام کیا ہے اور کیا آپ اتوار کو مجھے کچھ وقت دیں گے تاکہ میں آپ کو ڈل جھیل کے کنارے شام پانچ بجے ایک چائے پلا سکوں''

''آپ کا لہجہ بہت بے باک ہے''

''مفلسی اور یتیمی بہت کچھ سکھا دیتی ہے۔ کیا میں اتوار کو شام پانچ بجے آپ کا شالیمار باغ کے سامنے ڈل جھیل کے کنارے انتظار کروں؟''

''لیکن شام پانچ بجے ہی کیوں، چار بجے یا چھ بجے کیوں نہیں؟''

''کیونکہ میں سمجھتی ہوں، اس گنتی میں حقیقت پوری طرح موجود رہتی ہے۔ تو پھر ۔ ۔ ۔ ''

''میں ضرور آؤں گا''

نہ جانے میری زبان سے بے ساختہ کیسے نکل گیا۔ اُس نے مسکراتے ہوئے الوداعی ہاتھ بلایا۔ میں اس پراسرار لڑکی کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اس سے اتنا بھی نہ کہہ سکا کہ ۔ ''چلئے، میں آپ کو

آپ کے گھر چھوڑ دیتا ہوں"

اتوار آنے تک میں اس لڑکی کی پر اسرار باتوں میں کھویا رہا ۔ ۔

"یتیمی بہت کچھ سکھا دیتی ہے ۔ ۔ پانچ کی گنتی ۔ ۔ حقیقت ۔ ۔"

اتوار کی صبح سے لے کر شام چار بجے کا وقت بڑی مشکل سے گزرا۔ ساڑھے چار بجے تک میں شالیمار باغ پہنچ گیا تا کہ دور سے چھپ کر اس کی نقل وحرکت دیکھ سکوں۔ پونے پانچ بجے وہ بھی آگئی اور سامنے ڈال کے کنارے کھڑی ہوگئی، لیکن بے چینی سے بار بار گھڑی دیکھے جا رہی تھی۔ شاید پانچ بجنے کا انتظار کر رہی تھی۔

"پانچ" یہ خیال آتے ہی میں پوری طرح تیار ہوگیا اور جب ۳۰ سیکنڈ باقی رہ گئے تو اپنی جگہ سے نکلا اور بالکل پانچ بجے اس کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔

"دیکھیئے، آپ کے خیالات کی قدر کرتے ہوئے میں بالکل پانچ بجے آپ کی خدمت میں حاضر ہوں"

وہ اس ادا سے مسکرائی کہ میں نے موقعے کو غنیمت جانا۔ اِدھر اُدھر کی باتیں اور اس کے بارے میں جاننے کے بعد کہ یتیم لڑکی ہے۔ بچپن میں والدین کے فوت ہو جانے کے بعد رشتہ داروں کے یہاں پلی بڑھی ہے۔ اب ایک سرکاری دفتر میں کلرک ہے۔ میں نے بھی اپنے بارے میں سب کچھ بتاتے ہوئے اس سے محبت کا اظہار کر دیا اور جلد شادی کرنے کا خیال بھی ظاہر کر دیا۔ میں اس موقعے کو گنوانا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے سنجیدگی سے میری باتیں سنی اور اگلے اتوار کو اپنا فیصلہ سنانے کے لئے شام پانچ بجے نشاط باغ کا مقام طے کیا۔

اگلے اتوار کو جب ہم ملے تو اس نے میری محبت کو قبول کر لیا۔ ایک دوسرے کے ہاتھوں میں ہاتھ دیئے ہم باغ میں بیٹھے تھے۔ میں نے تجسس آمیز لہجے میں دریافت کیا ۔ ۔ ۔

"پچھلے ہفتے تم نے "پانچ" کے متعلق کچھ باتیں کی تھیں، میں زیادہ کچھ سمجھ نہیں سکا"

"پانچ کا میری زندگی سے بڑا گہرا تعلق ہے۔ جب میں پیدا ہوئی اُس وقت پانچ بج کر پانچ منٹ

ہور ہے تھے اور تاریخ بھی پانچ تھی۔ مہینہ بھی سال کا پانچواں ہی تھا۔ میری ولادت سے ٹھیک پانچ منٹ پہلے یعنی ٹھیک پانچ بجے ہمارے گھر میں مسلح چور داخل ہوا، اور سب نقدی زیورات سامنے رکھنے کی دھمکی دی۔ میرے والد بہادر آدمی تھے۔ اُسے پکڑنا ہی چاہتے تھے کہ اس نے انہیں پانچ گولیاں ماریں۔ پانچویں گولی کی دھماکے دار آواز سے میں اس دنیا میں وجود میں آئی۔ میرے باپ نے اُسی وقت دم توڑ دیا۔ ہماری کل نقدی جو پانچ لاکھ تک تھی، رشتہ داروں نے آپس میں بانٹ لی۔ پانچ ماہ بعد ہی میری ماں بھی اس دنیا سے چلی گئی۔ وہ بھی پانچ تاریخ تھی۔ اس کے بعد زندگی کے کئی موڑ آئے جس میں اس پانچ تاریخ کی بڑی اہمیت ہے۔ ''پانچ'' گنتی کا کام سچا اور مکمل ہوتا ہے۔ دیکھو، ٹھیک پانچ منٹ میں میں نے اپنی بات ختم کی''

پانچ، پانچ کے ورد سے میرا سر چکرا گیا۔ میں نے موضوع کو بدلنے کا ارادہ کیا۔ اسی وقت ہمارے پاس سے ایک انگریز گزرا جس کے ہاتھ سے ایک کتاب گری۔ اس کے سرورق پر ایک آدمی پستول لئے کھڑا ہوا بنا تھا۔ میں نے اس انگریز کو کتاب واپس کی۔ کامنی بولی ۔ ۔ ۔

''یہ گارڈز کا جاسوسی ناول ہے۔ ان کے ناول مجھے بہت پسند ہیں۔ اس میں ایک کردار پیری جو وکیل ہے، سچ میں ایک چالاک آدمی ہے۔ چالاک سے چالاک خونی کو سزا دلواتا ہے۔ لیکن میں سمجھتی ہوں کہ کسی خونی نے اگر پانچ خون کئے ہوں تو وہ اس وکیل سے بچ جاتا، کیونکہ پانچ کی گنتی حقیقی اور فتح کی ضمانت ہے''

''پھر پانچ، میں نے اپنے دل میں کہا اور ذہن کا رُخ بدلنے کے لئے اس کے ہاتھوں کو چوم لیا۔ تبھی سامنے سے ایک اخبار والا چیختا ہوا نکل گیا ۔ ۔ ۔

''شام کے اخبار کی سب سے بڑی خبر، ایک شخص نے چار خون کر دیے، لیکن وہ پکڑا گیا''

''اگر پانچ کرتا تو کبھی نہ پکڑا جاتا''

میں کامنی کے چہرے کو حیرانی سے تکنے لگا، لیکن اس نے میرے چہرے پر توجہ نہ کرتے ہوئے اپنی باہیں میرے گلے میں ڈال دیں اور گلے لگ کر کہا ۔ ۔ ۔

''اب چلنا چاہیے''

میں بھی اس کے جسم کی خوشبو میں سب کچھ بھول گیا اور اسے اپنی بانہوں میں کس کر پکڑا۔ کچھ لمحوں کے بعد ہم الگ ہو کر اپنی اپنی راہوں پر اگلے اتوار کی ملاقات کا وعدہ لئے چل پڑے۔

دوسرے دن سلطان نے مجھ سے ملتے ہوئے گلہ کیا ۔ ۔ ۔

''کیوں پیارے یہی دوستی ہے۔ دو ہفتوں سے دیدار نہیں ہو رہے''

''کیا بتاؤں یار جو تو مجھے کہتا تھا نا تو میں نے ۔ ۔ ۔''

''ہاں ہاں کل میں نے تجھے کامنی کے ساتھ نشاط باغ میں دیکھا تھا یار۔ تبھی تو میں تجھ سے ملنے یہاں آیا ہوں۔ مبارک ہو تیری زندگی تو سیٹ ہو گئی۔ محبوبہ بھی خوبصورت ملی اور شادی کے بعد اُس کی لاکھوں کی دولت کا بھی تو اکیلا وارث ہوگا''

''تو جانتا ہے اُسے''

''ہاں بہت اچھی طرح۔ یہ شہر کے مشہور سیٹھ رتن لال کی اکلوتی بیٹی کامنی ہے۔ کیوں تجھے معلوم نہیں؟''

''اس نے بتایا تو نہیں۔ خیر تو آ گیا بہت اچھا لگا۔ چل تجھے کافی پلاتا ہوں''

کچھ دیر اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد سلطان جب رخصت ہو گیا تو ٹیلی فون ڈائریکٹری سے سیٹھ رتن لال کے گھر کا نمبر ملایا۔

''ہیلو کون ۔ ۔ ؟''

''جی مجھے کامنی دیوی سے بات کرنی ہے''

''میں کامنی دیوی بول رہی ہوں، آپ کون؟''

اور اس کے بعد میں نے دل کے سارے پھپھولے اس کے سامنے پھوڑ دئے۔ وہ خاموشی سے میری بات سنتی رہی۔ پھر ٹھنڈے دماغ سے بولی ۔ ۔ ۔

''کیا میں تمہاری محبت کا امتحان نہیں لے سکتی''

''لیکن امتحان لینے کا یہ انداز تو بہت شاطرانہ ہے۔اپنے والدین کو مردہ قرار دینا ۔ ۔ ۔''

اس نے میری بات درمیان میں کاٹتے ہوئے کہا ۔ ۔ ۔

''تمہیں پتہ چلا۔وہ جو آدمی تھانا، جس نے مجھ پر چوری کا الزام لگایا تھا، کل رات اُس کا قتل ہو گیا''

''کیا ۔ ۔؟ یہ تو بہت برا ہوا، قاتل کو ضرور پکڑا جانا چاہیے''

''بالکل اگر اُس نے پانچ خون نہیں کئے تو ضرور پکڑا جانا چاہیے''

''لگتا ہے کہ تم مرتے دم تک 'پانچ' کی گنتی کا پیچھا نہیں چھوڑو گی''

''اس کے ساتھ میری زندگی کی کہانی جڑی ہوئی ہے''

''لیکن وہ کہانی جو تم نے مجھے سنائی تھی، وہ تو جھوٹی نکلی؟''

''کوئی دوسری کہانی بھی تو ہو سکتی ہے''

''لیکن یہ کیسے ثابت ہوگا کہ وہ جھوٹی ہے یا سچی؟'' ۔ ۔ میرا جاسوسی دماغ پھر کام کرنے لگا تھا۔

''دیکھتے جاؤ۔اچھا جان، اتوار کی صبح پانچ بجے ملتے ہیں، پہلگام جانے کے لئے، وہیں سارا دن گزاریں گے'' ۔ ۔ یہ کہہ کر اُس نے فون رکھ دیا۔

میں سوچنے لگا کیسی عجیب لڑکی ہے۔ایک بات صاف ہوتی ہے تو دوسری پُراسرار ہو جاتی ہے۔بہر حال اتوار کو پورا دن ہے۔اُس دن سارے راز کھل جائیں گے۔

دو دن بعد میں اپنے دفتر میں بیٹھا ہوا تھا کہ سلطان بدحواسی کی حالت میں میرے پاس آیا ۔ ۔

''تم نے آج صبح کا اخبار دیکھا''

''نہیں، جلدی میں تھا اس لئے نہیں دیکھ سکا۔سوچا دفتر میں لنچ ٹائم میں دیکھ لوں گا۔کیا بات ہے ؟اتنے گھبرائے ہوئے کیوں ہو؟''

''ارے یار تیری کامنی نے اپنے ماں باپ اور نوکر کا خون کر دیا، لیکن پکڑی گئی اور حوالات میں ہے''

''کیا ۔ ۔ ؟'' میری حیرانی کی انتہا نہ رہی۔اُسی وقت میں اُس سے ملنے چل پڑا۔

''تو تم نے آخر تین خون کر دیئے، اس لئے پکڑی گئی۔ اگر پانچ کر دیتی تو بچ جاتی''

اُس کے چہرے پر کوئی اضطراب نہ تھا۔ وہ پر سکون لہجے میں بولی ۔ ۔ ۔

''تین نہیں چار۔ اُس الزام لگانے والے آدمی کو بھی میں نے ہی مارا تھا۔ پانچواں نمبر تمہارا تھا۔ اگر پولیس کو ثبوت نہ ملا ہوتا تو میں پہلگام کی وادیوں میں تمہیں مار کر پانچواں خون کر دیتی اور پھر اپنے باپ کی دولت پر زندگی بھر عیش کرتی۔ اپنے خواب پورے کرتی۔ اپنے تصور میں جیتی''

''کیسا خواب ۔ ۔ کیسا تصور ۔ ۔ تم نے آخر یہ سب کیوں کیا؟''

''میں امیر ترین باپ کی اکلوتی بیٹی ہوں۔ بچپن سے میں نے جو چاہا، اُسے حاصل کیا۔ میری عجیب سے عجیب خواہش بھی پانچویں کوشش میں پوری ہو جاتی تھی۔ میں نے سب کچھ جھوٹ سے حاصل کیا۔ سچ اور حقیقت کی کوئی قدر نہیں اس دنیا میں۔ لیکن ادھر حقیقت میری سب سے بڑی دشمن بن گئی۔ ماں باپ میری شادی کے بارے میں سوچنے لگے جو کہ ایک حقیقت تھی۔ میرے بہت سے تصورات پامال ہونے لگے۔ میں گھٹن محسوس کرنے لگی۔ اُس آدمی نے سچ کہا کہ میں نے اُس کی دوکان سے بالی چرائی۔ اس لئے میں نے اس کا خون کر دیا۔ میرے ماں باپ نے مجھے جنم دیا۔ میرا وجود اُن کے سبب حقیقی بنا۔ اس لئے میں نے اُن کا خون کر دیا۔ میرا بوڑھا نوکر مجھے اپنی بیٹی کی طرح پیار کرتا تھا جب کہ میں اُس کی حقیقی بیٹی نہیں تھی۔ لیکن اُس کی بیٹی والی محبت حقیقی تھی، اس لئے میں نے اُس کا خون کر دیا۔ تم مجھ سے سچی محبت کرتے تھے، اس لئے میں تمہارا خون کر کے ''پانچ'' کی گنتی پوری کر کے بچ جانا چاہتی تھی لیکن چار کے بعد ہی پکڑی گئی۔ مجھے سچ سے نفرت ہے ۔ ۔ ۔ حقیقت سے نفرت ہے''

''یہ تمہارا پاگل پن ہے۔ تمہاری فطرت کی ضد نے آگے ترقی کرتے ہوئے فطری جرم کی شکل اختیار کر لی۔ اگر تمہیں حقیقت سے نفرت تھی تو تمہیں اپنے حقیقی وجود کو مٹا دینا چاہیے تھا۔ اپنی خونی فطرت کی تسکین کے لئے تم نے دوسروں کے وجود کو کیوں کر مٹایا''

یہ سن کر وہ میری طرف حیران نگاہوں سے دیکھنے لگی۔ یکا یک اس نے اپنا سر بہت تیزی سے

حوالات کی سلاخوں پر دے مارا۔ ٹکر میں اتنی شدت تھی کہ سلاخیں ٹیڑھی ہوگئیں۔ اس کے سر سے خون کی دھار بہہ نکلی اور وہ بے ہوش ہوکر زمین پر گر پڑی۔ زنانہ پولیس اُسے اُٹھا کر اسپتال کے لئے روانہ ہوگئی۔ میں آہستہ قدموں سے واپس چل پڑا۔ لیکن فیصلہ نہ کرسکا کہ وہ کیا تھی ۔ ۔ ۔ گنہگار ۔ ؟ فطرت میں شامل جرم کرنے کی خواہش سے مجبور ۔ ۔ ؟ مجھے اس سے نفرت کرنی چاہیے یا ہمدردی؟ یا پھر پیار جو کہ مختلف وجوہات کی بنا پر کبھی ختم نہ ہونے والی جدائی سے دوچار کرگیا تھا۔ میں آج تک یہ فیصلہ نہ کرسکا۔



مجرم

نینا نے جب روز شام کی طرح آج بھی اپنے سرخ گالوں کو مزید سرخ کرنے کے لئے اس پر غازہ ملا تو اس کا ذہن پانچ سال قبل اپنی وادی کے چنار کے درختوں کی جانب چلا گیا جو خزاں کے موسم میں سرخ ہو کر دیکھنے والوں کی نظر میں خوبصورتی کی زینت تو بنتے تھے، لیکن دراصل خود وہ موسم ان کے لئے اپنے وجود کے کھو دینے کا موسم ہوتا ہے۔ ایک ایسے ہی موسم کی رات جب فوجی وردی میں باہر کے دشمنوں نے اس کے گاؤں کو اپنے حصار میں لے لیا تھا اور گاؤں کے ہر گھر میں ظلم کرتے ہوئے اس کے والدین کے جسموں کو بھی گولیوں سے چھلنی کر دیا تھا۔ اُس وقت اس کے والدین نے اسے بھوسے کے ڈھیر میں چھپا کر اس کی جان تو بچا لی تھی، لیکن اب وہ بالکل بے سہارا ہو گئی تھی۔ رفیوجی قسم کے کیمپ میں جب دوسرے بے سہاروں کے ساتھ کچھ دن گزار کر اسے ایک تنظیم کے حوالے کر دیا گیا، ایک رات وہ دوسرے کچھ بچوں کے ساتھ بھاگ جانے میں کامیاب ہو کر واپس اپنی وسیع وعریض وادی تو پہنچ گئی لیکن اس کو وادی پہنچانے والا استاد کھوسی لال اب زبردستی اس کی پرورش پر آمادہ تھا۔ نینا کے لئے بھی اس کے علاوہ کیا چارہ تھا۔ کچھ ہی دنوں کی کڑی محنت سے اس نے گانے میں مہارت حاصل کر لی اور اب وہ ریاست کی مشہور، بڑی اور مہنگی گلوکارہ تھی، جس کی محفل تک عام لوگ تو کیا، چھوٹے موٹے رئیسوں تک کی رسائی نہیں تھی، کھوسی لال اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکا تھا لیکن دولت کی ہوس اسے گانے کے شوقین نئے نئے رئیسوں کی تلاش میں سرگرم رکھتی اور اس طرح نینا کے چاہنے والوں کی تعداد بھی بڑھتی جا رہی تھی۔

یکا یک نیل پالش کے زمیں پر گرنے کی آواز اس کو اپنے خیالوں سے واپس لائی۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ کھوسی لال سے رشتہ توڑ لے، لیکن دماغ کہتا تھا کہ احسان نہ بھولو، پھر دماغ پر مزید زور دینے سے ایک اور جملہ ذہن میں گونجتا، تقدیر۔۔۔! اس کے بعد نینا کو عجیب سکون حاصل ہوتا۔ 'چلو کبھی تو تقدیر سنورے گی، اگر تقدیر نہ ہوتی تو وہ بھی ایک نام ور گلوکارہ بن کر عیش کی زندگی جینے کے بجائے کسی کوٹھے کی زینت بھی بن سکتی تھی۔ خدا کا شکر ہے' تب اس کے منھ سے برجستہ نکل جاتا۔

''دس سال کی کمسن لڑکی کے ذہن کو وقت کے حالات کس قدر پختہ اور تجربہ کار بنا دیتے ہیں۔ پانچ سال میں میری زندگی بدل گئی''

لیکن ہمارے علاقے کے حالات نہ بدلے۔ حالانکہ مختلف صورتوں میں وہی دہشت، وہی وحشت۔۔۔ ارے نینا تو تو فلسفی ہوگئی' یہ خیال آتے ہی اس کے منھ سے قہقہہ زار پھوٹ پڑا۔

''کیا بات ہے نینا، اس قدر تیز ہنسی''

نینا نے پلٹ کر دیکھا اور فلسفیانہ انداز میں بولی ۔ ۔ ۔

''تم کب آئے، کھوسی لال''

کھوسی لال نے حیرت زدہ لہجے میں پوچھا ۔ ۔ ۔

''ارے نینا چاچا سے سیدھا کھوسی لال''

''تم نے بھی تو مجھے کبھی بیٹی یا بھتیجی نہیں کہا، کیوں ۔ ۔ ؟''

''وہ ۔ ۔ وہ ۔ ۔ اس لئے کہ ۔ ۔ ۔ میں ۔ ۔ میں'' ۔ کھوسی لال کی

زبان لڑکھڑانے لگی۔ نینا نے زور دار قہقہہ لگایا اور گھوسی لال کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ وہ وجہ آج ہی مجھے سمجھ میں آئی ہے۔ اس لئے میں نے آج سے اور ابھی سے تمہیں چاچا کہنا چھوڑ دیا ہے۔ تمہیں معلوم ہے، آج سے ہم فلسفی بھی ہو گئے ہیں' خیر تم بتاؤ کیسے آنا ہوا۔؟'

'تم تو جانتی ہو کہ ادھر کچھ دنوں سے جو انتشار تھا، اور جس کا اثر ہمارے کاروبار پر بھی پڑ رہا تھا، اب اسے ختم ہونے کے آثار نمایاں ہونے لگے ہیں۔ نئی حکومت کل بننے والی ہے۔ اسی خوشی میں جہاں پرانی تہذیب کے مطابق مرد عورتوں کے کپڑے پہن کر فنکارانہ رقص کریں گے۔ اس پر مسرت موقع پر تمہارا گانے کا پروگرام بھی ہے، اس میں سرحد پار سے بھی مہمان شرکت کررہے ہیں۔ دوسرے ملکوں سے بھی مہمان آرہے ہیں۔ اگر انھیں بھی تمہارا گانا پسند آ گیا تو قسمت چمک جائے گی'۔

'نئی حکومت کے بننے سے ہمارے مسائل حل ہو جائیں گے نا۔ مجھے سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ ان باہر والوں کو اس میں کیوں شامل کیا گیا ہے جن کے لوگوں نے ہمارے دلوں کو اتنے زخم دئے ہیں اور مسلسل ان کی یہ کاوشیں جاری ہیں'۔

'تم تو واقعی فلسفی ہو گئی ہو۔ کون آئے گا، کس کو بلایا جائے گا، یہ تو سیاست داں طے کرتے ہیں۔ تم ان سب چکروں میں کیوں پڑتی ہو۔ اپنے مستقبل پر نظر کرو۔ بردباری یہی ہے کہ جو کام اپنے بس میں نہ ہو، اُس کی جانب ضرورت سے زیادہ توجہ نہیں کرنی چاہئے''

جشن شروع ہوا۔ مرد عورتوں کے کپڑے پہن کر رقص کرنے میں اس قدر مشغول ہوئے کہ لگتا تھا ان کا اصل وجود یہی ہے۔

اس کے بعد عوام کی ترقی اور فلاح و بہبود کی قسموں سے پر تقریریں کی گئیں۔ وقفے کے بعد نیما کا گانے کا پروگرام تھا۔ جب اس کا گانا شروع ہوا تو ہر کوئی محو ہو گیا۔ گاتے گاتے وہ مہمانوں

کے آس پاس جا کر اپنی ادائے دلبرانہ سے ان کو مزید لطف فراہم کر رہی تھی۔ اسی انداز میں گاتے ہوئے وہ باہر سے آئے ہوئے ایک مہمان کے پاس پہنچی اور اس کے سامنے رکھی ہوئی ٹھنڈے کی بوتل کو پھوڑ کر اس کے سینے میں اتار دی۔ اس سے پہلے کہ کوئی کچھ سمجھ پاتا، باہری شخص بھی بنا کچھ سمجھے بغیر اپنی جان گنوا بیٹھا تھا۔ جشن ماتم میں بدل چکا تھا۔ نینا پولس کے شکنجے میں تھی۔ دوسرے دن نینا کے خلاف اندر اور باہر خوب نعرہ بازی ہوئی۔ باہر والے اسے حکومت کی سازش اور کچھ حفاظتی عملے کی ناکامی مان رہے تھے تو اندر والوں میں اس کا غصہ تھا کہ اس کی وجہ سے باہر اور غیر ملکوں میں بھی غلط تاثر گیا تھا۔ عدالت لگی، نینا سے سوال کیا گیا۔ ''وہ باہر والا میرے والدین کا قاتل تھا جب پانچ سال قبل ہمارے گاؤں پر حملہ کیا گیا تھا۔ میں نے ان کا بدلہ لے لیا''

''لیکن تب بات اور تھی، آج وہ نہ صرف باہر کا نمائندہ تھا بلکہ حکومت کا مہمان بھی تھا''

''حکومتوں کو مہمان بناتے ہوئے عوام کے جذبات کا خیال رکھنا چاہئے کیونکہ انھیں حکومت عوام پر ہی کرنی ہے''

''لیکن یہاں کی عوام بھی تمہارے اس عمل سے بے حد خفا ہیں۔ شائد تمہیں اس کی خبر نہیں''

'اس قسم کی عوام، حکومت اور باہر والے کیا میری جیسی عوام کے ساتھ نظریں ملا کر ہمارے ان سوالوں کے جوابات دے سکتے ہیں جو ہمارے دلوں پر زخم کی صورت ابھرے اور اب جیسے جیسے ان کا علاج کیا جا رہا ہے، وہ ناسور کی شکل اختیار کرتے جا رہے ہیں؟ ہے کوئی جواب کسی کے پاس۔'

عدالت پر سکوت طاری ہو گیا۔سینکڑوں کی تعداد والی بھیڑ نے مانو مردہ لاشوں کی صورت اختیار کر لی تھی۔ نینا نے ایک بار نظریں گھما کر چاروں طرف دیکھا۔سب کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔اس نے ایک شان بے نیازی سے عدالت کے ترازو کو دیکھا اور عدالت سے باہر نکل گئی۔اس کے پیچھے اس کی ہتھکڑی کو تھام کر چلنے والے ملازم ایسے لگ رہے تھے مانو ایک زندہ روح کے پیچھے چند لاشیں۔



میں ۔ ۔ کون؟

اب اس کا دل پتھر کا ہو چکا تھا۔ جرم کرتے کرتے جرم کرنے کا احساس اب مردہ ہوکر ایک طرح سے زندگی جینے کے ایک سلیقے، ایک فرض کی صورت اختیار کر گیا تھا۔ نہ جانے وہ کون سے حالات تھے، جنہوں نے اسے ایسا بنایا تھا۔ اس کی ہیبت بھی اتنی تھی کہ کوئی پوچھنے کی ہمت بھی نہیں کرسکتا تھا۔ لیکن نہ جانے کیوں کبھی کبھی وہ زاروقطار روتا تھا، خاص طور سے کچھ مخصوص راتوں کو، لیکن اس بارے میں بھی پوچھنے کی کسی کو ہمت نہ تھی۔ اس کے خاص دوستوں فضلو، کلو، للن اور شامو نے ایک بار اس بارے میں جاننے کی کوشش کی تھی لیکن بات پوری ہونے سے پہلے ہی اس کی آنکھوں میں اتر آئے خون کو دیکھتے ہوئے انھوں نے گھبرا کر بات چیت کا رخ دوسری طرف موڑ دیا تھا۔

نہ جانے کیوں وہ اپنا شکار ہمیشہ سرکاری کارندوں کو ہی اپنا نشانہ بناتا تھا۔ کئی بار دوستو ں نے اس بابت بھی دریافت کرنے کی کوشش کی لیکن جواب کے طور پر ہمیشہ اس کے لبوں پر ایک پھیکی سی مسکراہٹ آجاتی جس کے پیچھے غصے کا ایک شعلہ فشاں سمندر محسوس ہوتا اور یار دوست اس جواب سے بھی محروم رہے۔ اس کے علاوہ عوام کو لوٹنے کا تصور بھی اسے شاید کبھی نہیں آیا۔ دوستوں کی اتنی ہمت نہ تھی کہ اس کے ساتھ کے بغیر آپس میں مل جل کر بھی کسی لوٹ کو انجام دے سکیں۔ اس کا سب سے بڑا سبب وہاں کی چاک وچوبند پولس کا انتظامیہ تھا جو حکومت کے کارکنوں جن میں کہ خود پولس کا عملہ بھی تھا، کے علاوہ سب کی حفاظت بہ حسن وخوبی انجام دے رہی تھی۔ جب پولیس سرکاری برادری کی حفاظت میں ناکام رہی تو یہ ذمہ داری آر۔ پی۔ ایف۔ کو

سونپ دی گئی جس کے ایک افسر دلیر خان کا یہ بیان آج کے اخبار کی سرخی کی زینت تھا کہ جب تک پچیس ہزار انعام نہ پاؤں گا اور اس کے گروہ کو یا تو زندہ پکڑ کر جیل میں سڑا نہ دوں گا یا پھر کتے کی موت نہ مار ڈالوں گا تب تک یہاں سے اپنا تبادلہ نہیں ہونے دوں گا۔

''اچھا تو یہ ایک نیا حرامی پیدا ہوا ہے ہمیں پکڑنے کے لئے'' ۔ ۔ شامو اخبار کی سرخیوں پر نظر ڈالتے ہوئے غرایا۔

'یہ پولیس کا نہیں، آر پی ایف کا افسر ہے، ہم سے شکست کھا کر حکومت نے پولس سے ذمہ داری چھین کر انھیں سونپی ہے' کلو نے شامو کی بات آگے بڑھائی۔

''کیا باتیں ہو رہیں ہیں دوستو؟''

آج وہ اپنے فطری دوستانہ رنگ میں تھا، شامو نے ساری بات بتائی۔

''یہ بھی ہمارا کیا بگاڑ لیں گے، جب جب حکومتیں ۔ ۔ ۔'' وہ من ہی من بڑبڑایا۔

''کیا کہہ رہے ہو یار، ہم بھی تو سنیں''

'میں ۔۔۔۔ آگے کے پروگرام کا خاکہ تیار کر رہا تھا'

'لیکن اس سے پہلے اس حرامی کو سبق سکھانا چاہئے تاکہ انھیں احساس ہو کہ پولیس کو ہٹا کر ہمیں پکڑنے کے لئے کیوں ان کو بلایا گیا ہے'

فضلو نے پہلی بار اپنی گرج دار آواز کے ساتھ گفتگو میں حصہ لیا۔

''بالکل، ہمیں اس طرح للکارنے والے اس پہلے کتے کو اس کی سزا ملنی چاہئے تاکہ آئندہ کوئی بھی حکومت کا غلام اس قسم کی جرأت نہ کر سکے''

للن نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔

''اس کو بھی اپنے وقت پر سزا دے دی جائے گی یارو۔ ہاتھی چلتے ہیں، کتے بھونکتے ہیں''

''لیکن اس کے لہجے میں بھونکنے سے زیادہ کاٹ لینے کی بو آ رہی ہے۔ اس کا علاج تمہیں سب سے پہلے کرنا ہی پڑے گا'' ۔ ۔ ۔ سب نے یک زبان ہو کر کہا۔

'وہ' نے کچھ سوچتے ہوئے اپنی پستول کو کمر سے باہر نکال کر اسے جانچا اور دوبارہ کمر میں کھونس کر تیزی سے باہر نکل گیا۔

''بابا، آج میں آپ کو ڈیوٹی پر نہیں جانے دوں گی۔ میری آنکھ بھی پھڑک رہی ہے اور دل میں قسم قسم کے خیال آ رہے ہیں''

'میری پیاری بچی، ہمارے لئے یہاں ایک ایک دن قیمتی ہے۔ جس مقصد کے لئے میں نے زبردستی اپنا تبادلہ یہاں کرایا ہے، وہ جلد از جلد پورا ہو جائے تو فرض بھی ادا ہو اور جسم و روح کو سکون میسر آئے''

'بابا میں آپ کے ساتھ زندگی بھر رہ سکتی ہوں۔ مجھے کسی کی ضرورت نہیں'۔

'لیکن میرے بعد، ۔ ۔ ۔ میری پیاری بچی، ہمیں سماج میں رہنا ہے۔ پھر تمہیں بھی بہترین زندگی گزارنے کا حق ہے اور اس کا انتظام کرنا میرا فرض'۔

'لیکن بابا' ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ 'مجھے مت روکو میری بچی۔ مجھے پورا اعتماد ہے کہ اب کے قدرت ہمارے ساتھ ہے''

'اپنا یار اس کتے کو نپٹا کر واپس آ گیا۔ چلو اسی خوشی میں جشن مناتے ہیں'۔ شامو نے 'وہ'

کو آتے دیکھ کر ساتھیوں سے کہا۔

'یار میں وہاں گیا ہی نہیں، کیوں کہ ایک زبردست خبر ملی جو اس سے بھی زیادہ اہم ہے۔ سرکاری خزانہ جہاں رکھا گیا ہے، وہ جگہ اور اس تک جا کر کامیابی سے خزانہ لے کر حفاظت کے ساتھ واپس آ جانے کی پوری ترکیب میرے پاس ہے۔ پہلے یہ کام نپٹا لیتے ہیں۔ مجھے پورا یقین ہے کہ اس کے بعد آپ لوگوں کو دولت کمانے کی خاطر زندگی بھر کچھ نہیں کرنا پڑے گا'۔

'اور تمہیں۔۔۔۔۔؟'

'میں یہ کام دولت کمانے کے لئے نہیں کرتا۔ میرے اجداد کے پاس تو۔۔۔۔۔'

'تو۔۔۔۔؟'

'چھوڑو یار، کام کی بات سنو۔ ترکیب یہ ہے۔۔۔۔۔'

اس رات سارے کام ترکیب کے مطابق ہوئے۔ خزانہ لوٹنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ صرف چالیس پہرے داروں کو ایک خاص گیس کے ذریعہ ایک ساتھ بے ہوش کیا گیا۔ خزانہ لوٹنے کے بعد جب وہ حفاظت سے سڑک تک آ گئے تو وہ نے کہا۔

"دوستو، یہ شاندار کامیابی مبارک، اب تم لوگ یہ خزانہ لیکر ٹھکانے پر پہنچو۔ میں اپنا وہ ادھورا کام کر کے آتا ہوں"

'یار یہ وقت یہاں رکنے یا دوسرا کچھ کرنے کا نہیں ہے۔ سرکاری کتے ہماری تلاش میں کچھ ہی دیر میں چپے چپے پر پھیل جائیں گے۔ پھر وہ کتا تمہیں آج کوئی اکیلے تھوڑی نہ ملے گا'

"باتوں میں وقت ضایع مت کرو۔ کیا اتنی بڑی کامیابی کے بعد بھی تم لوگوں کو میری صلاحیت پر شک ہو رہا ہے"

ان سے کچھ کہتے نہ بنا۔ دوسرے ہی پل سب 'وہ' کی نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ کوئی پندرہ منٹ بعد جب پولس کی ایک جیپ ادھر سے گزری تو اس نے خود ہاتھ دکھا کر رکنے کا اشارہ کیا۔

'ارے، یہ تو 'وہ' ہے سب اپنی اپنی بندوقوں سے اسے نشانے پر لے لو۔ تم اب بچ نہیں سکتے 'وہ'

'حکومت کی کیا ہمت انسپکٹر کہ مجھے گرفتار کر سکے۔ میں نے تو تمہیں یہ بتانے کے لئے روکا ہے کہ وہ سرکاری خزانہ میں نے ہی لوٹا ہے۔ اور وہ کہاں ہے، یہ میں صرف آر۔ پی۔ ایف۔ کے افسر دلیر خاں کو ہی بتاؤں گا۔ مجھے وہاں تک لے چلو'۔

انسپکٹر کا سر چکرا گیا۔ اسے کچھ کہتے نہ بنا۔ 'وہ' شیر کی طرح انکے پاس آیا اور ایک کانسٹبل کو اشارہ سے پیچھے کرتے ہوئے خود آگے والی سیٹ پر انسپکٹر کے بغل میں بیٹھ گیا۔ کسی کو اسے ہتھکڑی لگانے کی ہمت نہ ہوئی۔

'تم مجھے ہی خزانے کے بارے میں کیوں بتانا چاہتے ہو؟'

'حقیقت تو یہ ہے کہ میں تمہیں بھی اس خزانے کے بارے میں نہیں بتاؤں گا'۔

دلیر خان کے ساتھ پاس کھڑے دوسرے آر پی ایف کے جوانوں پر حیرت طاری ہو گئی۔ 'پھر تم نے۔۔۔۔۔۔۔'

'میں اس گیدڑ کو دیکھنا چاہتا تھا جس نے شیر کے شکار کا ڈھنڈورا اخبار میں پیٹا تھا'۔ دلیر خان کے ساتھ وہاں موجود جوانوں کی آنکھوں میں بھی خون اتر آیا، لیکن کمال ضبط سے کام لیتے ہوئے اس نے دوبارہ کہا۔

'دیکھو، اپنے ساتھیوں کے پتے کے ساتھ ساتھ تم خزانے کا پتہ بھی بتا دو۔ ہم تمہارے ساتھ نرمی سے پیش آئیں گے'۔ اس نے ایک زوردار مضحکہ خیز قہقہہ لگاتے ہوئے جواب دیا۔

یہ ہنسی ان کے لئے ناقابل برداشت تھی۔ دلیر خاں کا اشارہ پاتے ہی سب اس پر ٹوٹ پڑے۔ کچھ دیر بعد جب 'وہ' بے دم ہو کر گر پڑا، اسے پھر اٹھا کر کرسی پر بٹھایا گیا۔

'آخر تم لوگوں کی سرکاری ملازموں سے کیا دشمنی ہے؟'

'حکومتوں کو ہم سے کیا دشمنی ہے؟'

'تم لوگوں کو اپنا نظریہ بدلنا پڑے گا'۔

'حکومتوں کو اپنی پالسی بدلنی پڑے گی'۔

' مجھے سمجھ میں نہیں آتا کہ تم خودحرام موت مرنے کے لئے ہمارے پاس کیوں آگئے'۔

'مخصوص راتوں میں گریہ وزاری کا کرب اب برداشت نہیں ہوتا'۔ اس نے دھیمے سے یہ کہا اور چہرے کا رنگ بدلنے کے ساتھ ساتھ اس کی آنکھوں سے اشکوں کے قطرے بھی چھلک پڑے۔

'لگتا ہے تمہیں اپنی بھول کا احساس ہونے لگا ہے۔ چلو اب جلدی سے۔۔۔۔۔۔'

'میں تمہارے پاس اس لئے آیا کہ اپنی موت سے پہلے تمہارے پورے عملے کی موت شکست کی صورت میں دیکھ سکوں'۔ 'وہ' نے ان کی بات کاٹتے ہوئے اپنی بات آگے بڑھائی۔

''یہ کیا بک رہا ہے تو''

'ابے گدھو، جب میں خزانے کا پتہ تم لوگوں کو نہیں بتاؤں گا، تو تمہارا عملہ جس مقصد کے لئے یہاں آیا ہے، وہ تو ناکام ہو جائے گا'۔

ایک بار پھر بنا کچھ کہے جوانوں نے اس پر لات، گھونسوں کی بارش کردی۔ اس کی ناک اور منھ سے خون کے فوارے پھوٹ پڑے۔ جب جوان تھک کر ایک طرف ہو گئے تو دلیر خان نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

'نہ جانے کیوں تمہاری صورت کچھ یاد کرنے پر آمادہ کرتی ہے۔ کون ہو تم ؟'

'اپنے چشمے کا نمبر بڑھوا بڈھے، مجھے دیکھ کر صرف تجھے اپنی موت یاد آنی چاہئے'۔

سامنے کھڑے جوان سے اپنے افسر کی یہ بے عزتی برداشت نہ ہوئی، اس نے ایک زور دار گھونسہ 'وہ' کے پیٹ میں مارا۔ اس کے منھ سے خون کا ایک فوارہ نکلا اور وہ دوہرا ہو کر زمین پر تڑپنے لگا، اُسی وقت ایک جوان نے اندر آتے ہوئے دلیر خان سے کہا

'مبارک ہو سر۔ حکومت نے آپ کی کامیابی پر آپ کو اس کے سر پر رکھے ہوئے پچیس ہزار کے انعام کے ساتھ دوسرے انعامات اور ترقی دینے کا بھی اعلان کر دیا ہے'۔

درد سے تڑپتے ہوئے 'وہ' کے منھ سے نکل پڑا۔ 'چلو، اب تم جیسے ایمان دار افسر کی بیٹی کی شادی اچھی طرح ہو جائے گی۔ اور جو بچ جائے،

اس سے تم اپنے جیسے دوسرے ایمان دار کی مدد کر دینا جو اپنا سب کچھ گنوا کر بھی حرام کی کمائی سے کوسوں دور ہو'۔

دلیر خان ششدر رہ گیا۔ اس نے دوڑ کر اس کا سر اپنی بانہوں میں لے لیا۔ 'بیٹا، تم کون ہو؟'

''میں ۔ ۔ ۔ آپ کا ۔ ۔ ۔ نہیں ۔ ۔ ۔ آپ کی طرح کا ۔ ۔ ۔ نہیں آپ کی ۔ ۔ ۔ طرف ۔ ۔ ۔ کا ۔ ۔ ۔''

اس سے پہلے کہ وہ جملہ پورا کر پاتا، موت نے اسے اپنی آغوش میں لے لیا۔

زاویہ

وہ رات بھی خوابناک تھی۔ ستاروں نے اُبھر کر جوانی اختیار کر لی تھی۔ سنہرے قمقموں کی روشنی میں عریاں جسموں کی خرید وفروخت بے جان روحوں کی توجہ کا مرکز بنی ہوئی تھی۔ رات کے اُجالے کی دوسری طرف سیاہی میں انجان مسافروں کو لوٹا جا رہا تھا۔ بدی کی بانہوں میں کاروبار ہو رہا تھا۔ رات کی آغوش سے جب سورج کی روپہلی کرنیں نکل آئیں، اُس وقت بازار کا زاویہ مختلف تھا۔ رات کے ڈاکو رنگ برنگ کپڑوں میں ٹہل رہے تھے۔ دوکانیں سج گئی تھیں۔ ان پر دُبلے پتلے اور موٹے جسم والے سیٹھ بیٹھ چکے تھے۔ زندگی کے ایک دوسرے زاویے کا کاروبار شروع ہو چکا تھا۔ روزمرّہ کی چیزوں کی خرید وفروخت کا بازار، جس میں ایک پوری دنیا آباد تھی۔ یہاں ہر قسم کے لوگ تھے، شریف، بدمعاش، عزت مآب خواتین، طوائفیں، اچھے اور برے سب سے بازار کی رونق تھی۔ دوکانوں پر گاہکوں کا ہجوم تھا۔ ان جیبوں میں مختلف قسم سے کمائے ہوئے روپے تھے۔ عجیب بازار تھا وہ، ہر قسم کی رنگینیوں سے مزیّن۔ یہ دوسرے بازاروں سے مختلف بھی تھا اور پرکشش بھی۔ اس کی سب سے بڑی خوبی اس کی تہذیب تھی جو دوسرے بازاروں میں نہ تھی۔ یہی وجہ تھی کہ کئی باہر کے دوسرے بازار جن پر اس کی خوشحالی سے اثر پڑتا تھا، نئی نئی سازشوں میں لگے رہتے۔ یہ بازار کی زندگی کا ایک اور مختلف زاویہ تھا۔ ایک دن روز کی طرح دن کے کاروبار میں گاہکوں کی پسندیدہ چیزوں کو پیک کیا جا رہا تھا اور ان کے پرس سے روپے نکل کر دُکانداروں کی دولت میں اضافہ کر رہے تھے کہ بازار نے ایک دم مختلف زاویہ اختیار کیا۔ کچھ لوگوں کی آپسی تو تو میں میں نے فرقہ وارانہ فساد کی صورت اختیار کر لی۔ کچھ لوگ آمنے سامنے ہجوم کی شکل میں ایک

دوسرے سے لوہا لے رہے تھے، تو عورتیں، بوڑھے، بچے اور دوسرے جوان جلد از جلد وہاں سے نکل جانے کی جدوجہد کر رہے تھے۔ دُکان دار بھی اپنی اپنی دُکانیں بند کر کے وہاں سے نکل جانے والوں میں شامل ہو گئے۔ جب تک پولیس آتی، چار لاشیں گر چکی تھیں اور کئی لوگ زخمی ہو کر موت اور زندگی کے درمیان ایڑیاں رگڑ رہے تھے۔ کچھ ہی دیر میں بازار میں سناٹا چھا گیا۔ جب رات آئی تو دھیرے دھیرے دن کا سناٹا مختلف قسم کے ہجوم سے گلزار تھا۔ دلال، بسیائیں، بے جان روحوں والوں کا جاندار جسموں کی خرید و فروخت کرنا، دوسرے قسم کے گاہکوں کا ہجوم۔ انجان مسافروں سے لوٹ، اچکہ گیری اور ہجوم کا فائدہ اُٹھا کر جیبیں تراش لینے والے ماہر فنکار۔ لیکن یہ ہنگامہ دیرپا ثابت نہ ہوا۔ گولیوں کی تڑتڑاہٹ نے بازار میں الگ قسم کا شور برپا کر دیا۔ بات پھیلی کہ باہر والوں نے بازار کے اندر کے کچھ ایسے ذہنوں، جو کہ خود کو بازار کی مختلف زاویوں والی زندگی پر دادا قسم کا حکمران سمجھتے تھے، سے مل کر فرقہ وارانہ فسادات کے بعد رات میں بھی بازار والوں پر یہ عنایت کی تھی۔ یہ بازار کی زندگی کا ایک اور مختلف زاویہ تھا۔ اس کے بعد دن اور رات میں نہ جانے کتنی وارداتیں ہوئیں۔ فوج کو بازار میں آ کر مورچہ سنبھالنے کا بھی حکم دیا گیا۔ ایک بار جو فوج بازار پر مسلط ہوئی تو پھر ـ ـ ـ اس رات جب فوج نے بازار کے لوگوں کو امان بخشنے اور ماحول کو سازگار بنانے کے لئے بازار میں قدم رکھا تو باہر اور اندر کے دوسرے قسم کے لوگوں نے بھی کبھی ظاہری اور کبھی باطنی طور پر مورچہ سنبھالے رکھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس بازار میں پھر کبھی صبح نہیں ہوئی۔ یہ بازار کی زندگی کا تازہ ترین اور بے حد کربناک زاویہ تھا۔ اب بازار والوں کو حقیقی صبح اور زندگی کے ایک نئے زاویے کا انتظار ہے، جو ان کے پرانے دنوں کو واپس لا کر ان کے غموں کا مداوا کر سکے۔



مقصد

بہت پہلے جب عورت پردے میں تھی تو گناہ اندھیروں میں ہوا کرتے تھے۔ تنگ و تاریک محلوں اور جھونپڑوں میں۔ لیکن آج جب کہ عورت دہلیز سے باہر آ گئی ہے تو جگہوں کی کوئی قید نہیں رہی۔ گلی گلی عورت بک رہی ہے۔ ہوٹلوں، کلبوں، پارکوں میں۔ نہ صرف اندھیروں میں بلکہ دن کے اُجالوں میں بھی عورت نیلام ہو رہی ہے۔ یوں سمجھو کہ دنیا ایک چکلہ ہے، ایک بازار ہے تو عورت ایک سکہ جو ۔ ۔ ۔

لوکل ٹرین کی ایک زوردار سیٹی نے فخرو کے خیالوں کو جھٹکا دیا۔ وی ٹی اسٹیشن آ چکا تھا۔ وہ اُترا، اور سامنے سڑک پار کر کے گلی سے ہوتا ہوا دوسری سڑک پار کرتے ہوئے اُس تعمیر ہو رہی عمارت میں آ گیا جہاں وہ مستری تھا۔ شام تک جی توڑ محنت کرنے کے بعد وہ پھر واپس وی ٹی سے دادر اپنی کھولی پر واپس آیا، تو مریم اُس کا انتظار کر رہی تھی۔

''بابا کھانا بن گیا ہے''

''ہاں بیٹی، بھوک بھی بہت لگی ہے'

'بابا! آج دن میں راموکاکا اور سوہن کاکا آپس میں باتیں کر رہے تھے کہ جن کے ماں باپ نہیں ہوتے، یا تو وہ یتیم ہوتے ہیں یا حرامی کی کوکھ والے۔ یہ کیا ہوتا ہے بابا؟ ۔ ۔ ۔'

''کیوں وہ دونوں آج کام پر نہیں گئے تھے کیا؟''

''نہیں۔ آج راموکاکا کی طبیعت خراب تھی اور سوہن کاکا اُن کی دیکھ بھال کر رہے تھے۔ بابا میری بھی تو ماں نہیں ہے۔ تو کیا میں بھی یتیم یا حرامی کی کوکھ والی ہوں''

آٹھ سال کی معصوم کے منھ سے یہ سن کر فخرو ششدر رہ گیا۔ پھر اُس نے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا

۔ ۔ ۔

''لیکن بیٹی، تمہارے بابا تو ہیں۔ بھلے ماں نہیں ہے تو کیا ہوا۔ دنیا میں بہت سے بچے ایسے ہیں۔ خود تمہارے بابا کی ماں بھی بچپن میں خدا کے پاس چلی گئی۔ تو کیا ہو گیا۔ اصل میں رامو اور سوہن گاؤں کے ہیں نا، تو اسی لئے ایسی بے تکی باتیں کرتے ہیں۔ ہم شہر کے ہیں۔ تم خود کو دیکھو۔ اتنی چھوٹی عمر میں اسکول بھی جاتی ہو، اور گھر کا کام کرتے ہوئے اپنے بابا کو کھانا بھی بنا کر کھلاتی ہو۔ اسی سے پتہ چلتا ہے کہ تم کتنی ہوشیار ہو''

مریم بابا سے اپنی تعریف سن کر خوش ہو گئی اور اس کے ساتھ ہی کھانا کھا کر نیند کی آغوش میں چلی گئی۔

''یتیم اور حرامی کی کوکھ والے''۔ ۔ یہ لفظ اس کی آنکھوں کے سامنے رقص کر رہے تھے۔ رامو اور سوہن نے بس ایک بات غلط کہہ دی کہ یتیم اور حرام کی کوکھ والے کو الگ الگ بانٹ دیا۔ اگر یہ دونوں ایک ہی ہوں تو ۔ ۔ جیسے کہ میں ۔ ۔ لیکن اس میں اس کوکھ سے جنم لینے والے کا کیا قصور؟ جس کو یہ بھی نہ معلوم ہو کہ اس کا باپ کون تھا۔ اور جب ماں نے بھی خودکشی کر لی جب وہ پندرہ برس کا تھا اور حرام حلال کو اچھی طرح سمجھ سکتا تھا۔ اس کی ماں ویسے تو سیدھی سادھی تھی، بعد میں پاس میں رہنے والی چاچی نے بتایا تھا کہ اس کی ماں واقعی سیدھی سادھی تھی، جس سے ایک سیٹھ نے چوری چھپے شادی تو کی لیکن دنیا کے سامنے اپنانے کی ہمت نہ جٹا سکا، اور اسے اس کے پیٹ میں پل رہے بچے کے ساتھ تنہا چھوڑ کر اپنی دنیا میں واپس چلا گیا۔ اس کی ماں بھی اتنی غیرت مند تھی کہ مرتے دم تک اس کے والد کا نام اپنی زبان پر نہ لائی۔

''پتہ نہیں ماں جھوٹ بولتی تھی یا سچ۔ ویسے بھی جب تک اس دنیا میں سچ کا ثبوت نہ ہو، اُسے جھوٹ ہی مانا جاتا ہے۔ مریم آٹھ سال کی ہے۔ آٹھ سال کے اندر وہ جوان ہو جائے گی، پھر اس کی شادی، اوہ! تو میرے پاس اس کی شادی کے انتظام کو صرف آٹھ ہی سال بچے ہیں۔ یہ وقت تو مجھ جیسے مستری کے لئے کم ہے۔ اگر پرانا دھندا کرتا تو ۔ ۔ ۔ تو شاید اب تک زندہ بھی ہوتا یا نہیں،

یا پھر جیل میں یا پھر وہی بدنام اور بے مقصد زندگی ۔ ۔ ۔ ''

آج وہ مستری ہے، لیکن اس کے پاس مریم کی صورت میں زندگی کا مقصد تو ہے۔ ٹرین کی سیٹی نے پھر اس کے خیالوں کو منتشر کر دیا ۔ ۔

''اُف! کس قسم کے خیال تھے جو سچ تو تھے لیکن کتنے خوفناک ۔ ۔ ''

وہ اُٹھا اور سوتی مریم کے سر پر شفقت کا ہاتھ پھیرا۔ پھر پانی پی کر واپس اپنے بستر پر آ کر لیٹ گیا۔ لیکن پھر اس کی ذہن ماضی کے خیالوں میں گم ہو گیا۔ ۔ ۔

''صمد میرا پیارا دوست، جس نے میری دوستی اُس وقت بھی نہ چھوڑی جب سارے لڑکے مجھے حرامی کہہ کر میرا انداق اُڑاتے تھے۔ اس کے والدین اس پر کتنی سختی کیا کرتے تھے۔ لیکن تھا وہ میرا پکا یار۔ ماں کے مرنے کے بعد بھی اُس نے میرا ساتھ نہ چھوڑا اور میرے ساتھ وادی چھوڑ کر بمبئی بھاگ آیا، اور جب مجھے چائے کے ہوٹل میں کام مل گیا، تب وہ میرے زبردستی کرنے پر واپس آ گیا۔ لیکن ہر تیسرے دن ایک دوسرے کو خط لکھنے کا سلسلہ اس کی موت تک بند نہیں ہوا۔ اس کی موت ۔ ۔ ۔ اس کے ساتھ ریشما بھابی کی ۔ ۔ ۔ اگر مریم کو میں اپنی گود میں نہ کھلا رہا ہوتا اور وہ بھابی یا صمد کے ہاتھ میں ہوتی تو ۔ ۔ اور اگر میں دو سال کی معصوم یتیم بچی، اپنے دوست کی نشانی مریم کو لے کر بھاگ نہ آتا ۔ ۔ تو ۔ ۔ چائے کی دُکان سے جرم کی دنیا میں قدم رکھ چکی میری زندگی کو یہ پاک مقصد کیسے ملتا۔ آج کا راجو دادا جو کہ ایک زمانے میں میرا شاگرد ہوا کرتا تھا اور پپو جو کہ ہر جرم میں میرے ساتھ تھا، اور دوسرے میرا کتنا مذاق اُڑاتے تھے، اور اپنی دنیا کی عیش بھری زندگی کی طرف مجھے لوٹانے کی کتنی کوششیں کیں، لیکن ایک دن جب مجھ سے یہ جواب سنا کہ ۔ ۔

''سالو! پیغمبروں نے تو ساری زندگی مصیبتیں اُٹھائیں، کن کے لئے، پھانسی کے تختوں پر چڑھے، کن کے لئے۔ پھر میں ایک بچی کی خاطر مستری بن گیا، تو کیا ہوا۔ جواب دینے کی کسی کی ہمت نہ ہوئی۔ پھر بھی آج تک ہم دوست ہیں، لیکن راہیں بالکل مختلف۔ صمد ۔ ۔ کاش تو اُس دن

میری بات مان جاتا۔ کیا ضرورت تھی تجھے نعرہ بازوں اور پولیس کے درمیان صلح صفائی کے لئے آنے کی اور زخمی پولیس اہل کاروں اور نعرہ بازوں کو ایک ساتھ اسپتال لے جانے کی۔ نتیجہ دیکھا، دونوں کو شبہ ہوا کہ تو مخالف گردہ کا آدمی ہے اور اُس دن جب میں روز کی طرح ملنے آ گیا اور مریم کو گود میں لے کر بازار کچھ خریدنے نکلا، تو راستے میں ہی میں نے نعرہ بازوں کے ایک گروہ کو گھر کی طرف آتے دیکھا۔ میں نے گھبرا کر پولیس کو اطلاع کی۔ پولیس وقت پر آئی بھی، جس سے نعرہ بازوں کو یقین ہو گیا کہ تو ان سے ملا ہوا ہے۔ اِدھر پولیس نے جو نعرہ بازوں کی جماعت کو کرسیوں اور زمین میں مہمانوں کی طرح بیٹھے دیکھا تو وہ سمجھے کہ تو ان کا ساتھی ہے۔ پھر کیا تھا، تیرے گھر کو آگ لگا دی گئی جس میں بھابی زندہ جل گئیں، اور تو باہر لات گھونسوں، لاٹھی اور گولی کا شکار ہو گیا۔ تیرا چہرہ اُس بڑے پتھر کے نیچے اس قدر کچل گیا تھا کہ شکل ۔ ۔ اُف خدایا

میں مریم کو لے کر وہاں سے بھاگا، تو آج تک پھروادی کا رُخ نہیں کیا۔ یہ سوچتے سوچتے اس پر ایسی کیفیت طاری ہوئی کہ زار و قطار رونے لگا۔

''کیا بات ہے بابا، کیوں رو رہے ہو؟ ۔ ۔ مریم جاگ کر اس کے پاس بیٹھتے ہوئے بولی۔۔

''کچھ نہیں بیٹی ۔ ۔ میں ۔ ۔ یہ ۔ ۔ سوچ کر رو پڑا کہ ۔ ۔ کہ ۔ ۔ تیری شادی اچھی طرح کیسے کر سکوں گا ۔ ۔ میں ۔ ۔ میں تو غریب مستری ہوں''

''تم کیوں فکر کرتے ہو بابا ۔ ۔ اُس کی فکر تو خدا کو ہونی چاہیے''

''کیوں ؟''

''آج اسکول میں اُستانی جی نے حدیث پڑھ کر سنائی کہ جب کسی کو بیٹا ہوتا ہے، تو خدا اُس سے فرماتا ہے کہ جا اور اپنے باپ کا بازو بن۔ اور جب کسی کے یہاں لڑکی ہوتی ہے تو خدا اُس سے فرماتا ہے کہ مجھے میری عزت کی قسم! بے شک میں تیرے باپ کا بازو ہوں۔ تو بابا جب سارے جہاں کا مالک خدا تمہارا بازو ہو

وہ حیران نگاہوں سے مریم کو تکنے لگا ۔ ۔ ''بیٹی تم تو بڑی سمجھ دار ہو''

"شہر کی ہوں بابا ۔ ۔ اور پھر تمہاری بیٹی کیوں سمجھ دار نہ ہو"

"شاباش میری بچی" ۔ فخرو کو یوں لگا کہ ایک برکت والا سکون اسے حاصل ہو گیا ہے۔ اس نے مریم کو اپنے پاس ہی سلایا اور خود بھی نیند کی آغوش میں چلا گیا۔



پروفیسر عبدالقادر سروری صاحب سے ایک گفتگو

(یہ انٹرویو 1968ء میں لیا گیا تھا جس وقت ہم ترمبو برادران یونیورسٹی اور کالج کے طالب علم تھے۔ میں ایم اے (اُردو) میں ہونے کے سبب اُن سے زیادہ قریب تھا، اس لئے کہ اُس دور میں اردو کا یہ رسالہ ''نگینہ'' ہم اپنے صرفہ پر نکالتے تھے۔ سروری صاحب، حامدی کاشمیری اور شکیل الرحمٰن صاحبان کے علاوہ دیگر اساتذہ کرام بھی ہماری اس کاوش کو ستائش کی نظروں سے دیکھتے تھے۔ یہ انٹرویو 1969ء میں ''نگینہ'' میں شائع ہوا اور اسے بہت شہرت ملی)

اکتوبر کے اس مہینے میں غیر متوقع طور پر دھوپ کئی دنوں سے کھلی کھلی نکل رہی تھی۔ میرے دماغ میں خیال آیا کہ کیوں نہ پروفیسر موصوف کا ایک انٹرویو لے کر اسے ''نگینہ'' میں شائع کر کے رسالہ کے وقار میں اضافہ کیا جائے۔ کچھ ہی دیر میں، میں اُن کے کمرے کے سامنے کھڑا بورڈ دیکھ رہا تھا ۔ ۔ پروفیسر عبدالقادر سروری ۔ صدر (شعبہ اردو)

اُنہوں نے اندر بلایا اور میں نے اپنا مدعا بیان کیا۔ اُن کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ دوسرے دن گھر پر شام پانچ بجے حاضر ہونے کا حکم ہوا۔ وہ رات اور دوسرا شام چار بجے تک کا دن بڑی بے قراری میں گزرا۔ میں نے اپنے برادر اصغر محمد ظہور ترنبو جو کہ ''نگینہ'' کے مینجنگ ایڈیٹر تھے، کو ساتھ لیا اور امیرا کدل سے جواہر نگر تک کا ٹانگہ لیا۔ راستے میں ہی سروری صاحب مل گئے اور گھر لے گئے۔ چائے چسکی لیتے ہوئے گفتگو شروع ہوئی۔

وحشی سعید ۔ ۔

سروری صاحب! آج کے حالات کو دیکھتے ہوئے اردو زبان و ادب کے سلسلے میں سب سے اہم سوال یہ ہے یا ہو سکتا ہے کہ آزاد ہندوستان میں اردو کا مستقبل روشن ہے یا تاریک؟

سروری صاحب ۔ ۔

اردو کا مستقبل وہی ہوگا جو کہ اردو بولنے والوں کا ہوگا۔ ہم جس ملک میں رہتے ہیں وہاں کچھ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اردو مسلمانوں کی زبان ہے، اس لئے کہ ہمارا مذہبی اثاثہ عربی اور فارسی سے اردو میں منتقل ہوا، اور ان دونوں زبانوں کے بولنے والوں کی اکثریت مسلمان تھی یا ہوگئی تھی۔ چونکہ اردو زبان میں ان دونوں زبانوں کے الفاظ کثرت سے ہیں، اور وہ دونوں زبانیں باہر کی ہیں، اس لئے یہ بھی سمجھا گیا کہ اردو بھی باہر کی زبان ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کا حقیقت سے دور دور تک کوئی تعلق نہیں ہے۔ پاکستان کی بات چھوڑ دیں کہ وہاں کی قومی زبان اردو کیوں ہے۔ یہ وہاں کے چاروں صوبوں کی الگ الگ زبانوں کے ہونے کے سبب اتحاد کے سیاسی نقطے کے تحت بلی کا بکرا بنی، یا اس کی کوئی اور وجہ تھی۔ میرے خیال میں یہاں اردو زبان و ادب باقی رہے گا اور یہ اپنے انداز میں ترقی بھی کرے گی۔ اس کے کچھ منطقی شواہد بھی ہیں اور دلائل بھی۔ ایک تو یہ کہ یہاں اردو بولنے والوں کی تعداد ہزاروں میں نہیں کروڑوں میں ہے۔ دوسرے یہ ایک تہذیبی زبان

وحشی سعید ۔ ۔

لیکن سروری صاحب، اگر حکومت کی بے اعتنائی ہو تو زبان و ادب کی ترقی پر اس کا منفی اثر پڑے گا نا ۔ ۔ ؟

سروری صاحب ۔ ۔

بالکل پڑے گا۔ آپ نے بڑی اہم بات کہی، لیکن اُس صورت میں بھی یہ اپنے معتدل انداز میں

باقی رہے گی۔ آپ لوگ تو کشمیر سے نکل کر ہندوستان کے یو پی، بہار، دہلی، حیدر آباد وغیرہ جاتے رہتے ہیں اپنے رسالہ کے سلسلے میں۔ ہر جگہ تھوڑے بہت فرق کے ساتھ اردو بولی جاتی ہے۔ خود ہندی میں اردو کے کتنے الفاظ ہیں۔ بعض اوقات ایسا محسوس ہوتا کہ ان میں کوئی فرق ہی نہیں ہے، ایک ہیں دونوں زبانیں۔ دوسرے علمی زبان میں اسپیچ ہیبٹ آسانی سے نہیں مرتی اور پھر حکومتوں کی بے اعتنائی تو اپنی پالیسی کے حساب سے ہوتی ہے جو تبدیل بھی ہوتی رہتی ہے۔ کچھ دن میں اُمید ہے کہ جب حالات سازگار ہوں گے تو اسے مرکزی اور صوبائی حکومتوں کی سرپرستی دوبارہ پہلے کی طرح حاصل ہوگی۔ اور پھر ایک نئے انداز کے ساتھ اردو ادب میں اہم موڑ بھی آئیں گے۔ ایک چیز ہے جس کو ہم افادیت کہتے ہیں۔ افادیت اور سہولت دو چیزیں ہیں۔ ہندوستان کے مستقبل کے بارے میں کیا کہا جاسکتا ہے؟ یہی نا کہ جس راستے پر دوسرے ملک جارہے ہیں اُسی طرف ہندوستان بھی۔ یعنی صنعتی ترقی کی جانب۔ ظاہر ہے کہ جب حیات کے دوسرے شعبے ترقی کریں گے تو اردو زبان وادب بھی ترقی کرے گا۔

وحشی سعید ۔ ۔

لیکن ایسی صنعتی زندگی میں ادب کا کیا مقام ومرتبہ رہے گا۔

سروری صاحب ۔ ۔

میرے خیال میں ایسی صنعتی زندگی جس میں تمام آسائش زندگی موجود ہے لیکن دل ودماغ محض انہیں کی حصولیابی میں اُلجھا ہوا ہے، ادب کی اہمیت مزید بڑھ جاتی ہے۔ آپ کے پاس میل ٹوکن موجود ہے، روٹی رکھی ہوئی ہے لیکن قلبی سکون میسر نہیں ہے۔ دوسرے سکون جو عارضی طور پر سکون دیتے ہیں وہ بعد میں زیادہ تر ایک مہلک بیماری کی شکل اختیار کرلیتے ہیں جو زندگی کے ساتھ ہی ختم ہوتے ہیں۔ تو ایسی صورت میں ادب کی اہمیت اور مقام ومرتبہ یقیناً باقی رہے گا۔ دیکھو جو صنعتی ترقی ہورہی ہے وہ زندگی کی راہیں بھی تو بدل رہی ہے۔ آپ کو جو آرائش والدین کے زمانے میں

ملتی تھیں، آج اس سے زیادہ آپ کو چلن سے زیادہ اس عمر میں اختیارات بھی حاصل ہیں، پھر بھی آپ کو اطمینان قلب میسر نہیں۔ یہ اطمینان قلب کا نہ ہونا آپ کو کچھ کرنے پر آمادہ کرتا ہے۔ چنانچہ آپ جو اس وقت پڑھتے ہیں ۔ ۔ نہ پڑھتے تو کیا فائدہ؟ روٹی آپ کے لئے رکھی ہوئی ہے لیکن آپ کو یہ شعور ہے کہ اگر میں کچھ نہ کروں گا تو میں میں ہو جاؤں گا۔ اس رو کو برقرار رکھنے کے لئے آپ کو زمانے کے ساتھ چلنا پڑے گا لیکن اس وقت آپ پیچھے پلٹ کر بھی نہیں دیکھتے۔ یہی بات ادب پر بھی صادق آتی ہے۔ اردو ادب میں جو لوگ بھی سنسکرت اور ہندی الفاظ کے کم ہونے کی شکایت کرتے ہیں، اُنہیں دیکھنا چاہیے کہ اردو تمام زبانوں کا مرکب ہے جو ملک میں بولی جاتی رہی ہیں اپنے اپنے وقتوں میں۔ میرا خیال ہے کہ آنے والے وقتوں میں ہندی اتنی بدل جائے گی کہ اردو سے بہت قریب ہو جائے گی۔

وحشی سعید ۔ ۔

لیکن محض چند قیاسات کی بنیاد پر کیسے کہا جا سکتا ہے کہ ہندی اُردو سے اتنی قریب ہو جائے گی۔

سروری صاحب ۔ ۔

اس کے چند ایسے قیاسات ہیں جو حقیقت کا روپ لے رہے ہیں۔ اردو بولنے والے خود کو کامن مین سمجھنے لگے ہیں۔ اس لئے عام آدمی سے ان کا گہرا تعلق اس صورت میں ہے کہ وہ عام آدمی کی زبان کو اردو میں رائج کر رہے ہیں۔ اردو کے مقابلے میں ہندی کی زبان جو ہے وہ بڑے لوگوں کی زبان ہے۔ یہ ہو رہا ہے کہ اردو میں ہندی کے اچھے لفظ آ رہے ہیں، جیسے ہندی لفظ آدرش لے لیا ہے۔ اس کے علاوہ مثال کے طور پر ہمارے یہاں جس لفظ کو ''چالو'' کہتے ہیں، مراٹھی میں اس لفظ کو ''چلتا ہے'' کہتے ہیں۔ ہندی والے اس کو ''پرچلت'' کہتے ہیں۔ ''چالو'' کے لفظ کو ہندی والے حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ یہ لفظ عام آدمی بولتا ہے۔ حالانکہ ''چالو'' کو وہ لوگ بھی زیادہ سمجھتے ہیں۔ اس ذہنیت کو زمانے کا معاشی دباؤ ختم کرے گا۔ اردو بولنے والے بھی

کبھی کبھی نزاکتوں میں پڑتے ہیں۔ ہمارے یہاں مولوی صاحب تھے، جب کبھی ہمارے منہ سے موسم سنتے، ہمیں تھپڑ مارتے کہ موسم کہو۔ یا کبھی ہم لفافہ کہتے تو وہ جھڑک دیتے کہ لفافہ کہو۔ لیکن لفافہاور موسم سب ہی بولتے ہیں۔ ایسے حالات میں اردو نہ صرف ترقی کرے گی بلکہ اور زبانوں کی طرح اپنارول ادا کرے گی۔ (یہ کہہ کر سروری صاحب سگریٹ سلگانے لگے)

وحشی سعید:

لیکن سروری صاحب یہ جوایک بات سامنے آتی ہے کہ اردو زبان نے فارسی کے بدلے سنسکرت کے الفاظ کیوں نہیں اپنائے؟

سروری صاحب ۔ ۔ (سگریٹ کا کش لیتے ہوئے)

ایسا کیوں نہیں ہوا، اس کے کئی وجوہات ہوسکتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ سنسکرت زبان میں اتنی ادبیت آگئی کہ وہ خود ایک بہت پڑھے لکھے طبقے کی زبان بن کے رہ گئی اور اس کی جگہ عام بول چال کی علاقائی زبانیں زیادہ بولی جانے لگیں۔ کسی بھی دور میں کسی بھی زبان کو زبردستی عروج یا زوال پر نہیں رکھا جاسکتا۔ جس زبان میں لوگوں کو متوجہ کرنے اور کافی حد تک اُن کے معاشرتی مسئلوں کے حل یا اس کی جانب عام طور پر، خاص طور پر نہیں راہ دکھانے کی صلاحیت زیادہ ہوگی وہ زبان اپنے بولنے والوں کے ساتھ رائج بھی رہے گی اور زندہ بھی رہے گی۔ انگریزی زبان اس کی سب سے بڑی مثال ہے۔ انگریزی کے خلاف ایک منظّم اور اشتعال انگیز یا یوں کہیں کہ اپنی زبان کے تقابل کے غیرت مندر رجحان کے باوجود محض اپنی صلاحیتوں کے بل پر پوری دنیا میں پھیل رہی ہے، معاشی زندگی کی ترقی کے لئے امکانات کی اگر جستجو ہے تو انگریزی سے دامن نہیں چھڑایا جاسکتا۔ اس کی محتاجگی کا انجام یہ ہوگا کہ ہم یا ہمارا ملک یا کوئی بھی ملک دنیا کے ساتھ نہیں چل سکتا۔ عالمی سطح پر اپنی صلاحیت کی شناخت قائم نہیں کرسکتا۔ دوسری وجہ لسانی وجہ ہے۔ جب مسلمان ہندوستان آئے جیسا کہ سلیمان ندوی نے زور دیا ہے کہ وہ سندھ میں آئے لیکن زبان پنجاب سے

آئی کیونکہ محمود شیرانی کے مطابق ۔ ۔ ۔

''وہاں دوسو سال تک مسلمانوں کی حکومت رہی۔ انہوں نے کچھ تاریخی شواہد بھی دئے ہیں اور کچھ لسانی شواہد پیش کئے ہیں جو زبان کے ڈھانچے سے تعلق رکھتے ہیں، جو زبان اردو سے ملتی تھی، پنجابی سے بہت گہرا واسطہ رکھتی ہے''

وحشی سعید ۔ ۔

لیکن یہ سوال بھی تو پیدا ہوتا ہے کہ سندھ میں مسلمان آئے تو وہ کیا وجوہات تھیں کہ یہاں اردو زبان پنجاب کی طرح ترقی نہیں کرسکی؟

سروری صاحب ۔ ۔

بالکل سوال ہے اور اس کا جواب یہ ہے کہ جب مسلمان سندھ میں آئے تو ہمیں پتہ نہیں کہ لسانی طور پر وہاں کیا ہوا۔ اس بارے میں کوئی تاریخی شواہد کم از کم اب تک تو میری نظر سے نہیں گزرے۔ بعد میں وہاں ایک شاعر مسعود سلمان ہوئے۔ ان کا ایک دیوان تھا، ایسا ذکر کرتے ہیں سب اردو تاریخ لکھنے والے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ وہ ہمارے ہاتھ میں نہیں ہے۔ وہ اس وقت ہماری دسترس میں نہیں ہے۔ کہتے ہیں ان کا یہ دیوان ہندی میں تھا۔ یہ ہندی کا دیوان اگر مل جاتا تو کچھ بات طے ہوجاتی۔ مسعود سلمان کی فارسی شاعری میں کچھ ایسے الفاظ ملے ہیں۔ الفاظ سے کسی زبان کے آغاز کے بارے میں تسفیہ کرنا بڑا مشکل ہے۔ جو لسانی ثبوت محمود شیرانی نے فراہم کئے ہیں وہ کسی حد تک قابل اعتماد ہیں، خاص کر یوپی کے لوگ اردو زبان سے محبت کی وجہ سے انکار تو کررہے ہیں کہ اصل میں کیا ہوا؟ یہ بڑا پیچیدہ مسئلہ ہے۔ مسلمان جب پنجاب سے ہریانہ ہوتے ہوئے آئے تو اپنے ساتھ زبان بھی لائے اپنی۔ ہریانہ میں اس کی کچھ ترقی ہوئی لیکن وہاں پروہ ٹھہرے نہیں۔ اس کے بعد وہ دہلی آئے، وہی ان کا سب سے بڑا پڑاؤ رہا اور مستقل پڑاؤ رہا۔

ہم جانتے ہیں کہ اردو اپنے موجودہ روپ کے ساتھ دہلی میں ہی ترقی کرنے لگی۔ اس کو بھی ہم یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتے۔ دہلی میں جو ابتداء میں اردو کا فارم تھا۔ مثال کے طور پر ہم سب سے پہلے سمجھتے ہیں کہ دہلی میں زیادہ مصطفیٰ خان یک رنگ وآبرو معاصرین تھے۔ لیکن اس سے پہلے ایک روایت چلی آ رہی تھی کہ وہ اس زبان میں لکھتے تھے جس زبان میں دہلی کے ابتدائی شاعر لکھتے تھے۔ اس سے پہلے ولی کے کلام میں بھی وہ آثار ملتے ہیں۔ دہلی کی اُس وقت کوئی زبان نہیں تھی۔ لسانیات کے ماہر کہتے ہیں کہ دہلی پانچ زبانوں کا سنگم تھی۔ اس کو جو اجزاء اِدھر اُدھر مل گئے تھے، ان زبانوں کو انہوں نے اُٹھالیا اپنی سہولت کے لئے۔ انہوں نے کچھ الفاظ لئے اور وہ اسی کو استعمال کرنے لگے اور ہندوستان کے جو اُس وقت لکھنے والے تھے، وہ اس زبان کو اہمیت نہیں دیتے تھے۔ وہاں یہ پانچ زبانیں الگ الگ طرح کی تھیں۔ لوگ زبان کی خصوصیت اچھی طرح جانتے ہوں لیکن اس کے علم سے واقفیت نہ ہو، ایسا بھی ہوا۔ آپ کشمیری ہیں، کشمیری ہی بولیں گے۔ کرگل والے بھی کشمیری بولیں گے لیکن سرینگر کی کشمیری اور کرگل کی کشمیری میں آپ فوراً محسوس کرلیں گے فرق کو۔ حالانکہ دونوں میں کچھ مناسبت ہے۔ شاید آپ کرگل کی کشمیری کو معیاری زبان نہ سمجھیں۔ اگر کرگل کی کشمیری میں ترقی ہو تو آپ اعتراض کرسکتے ہیں۔ ہندوستان کی زبانوں کا یہی حال تھا۔ ان میں تھوڑا تھوڑا فرق تھا لیکن وہ مطمئن زبانیں نہیں تھیں۔ ہندوستان میں اپنی اپنی زبانیں تھیں۔ خاص طور پر برج بھاشا تھی۔ برج بھاشا جو تھی وہ دہلی کے قریب ترین علاقے یعنی متھرا کی زبان تھی اور یہ زبان اس لئے اہمیت رکھتی تھی کہ اس میں کچھ بڑے شعراء نے مثلاً سورداس نے اپنی کرشن بھکتی کی شاعری سے بہت اونچا اُٹھادیا اور عوام میں مقبول ہوگئی تھی۔ تو ظاہر ہے کہ اس زبان کو چھوڑ کر اس زبان میں نہیں لکھ سکتے تھے۔ یہ زبان جو ایک جگہ سے، دوسری جگہ سے ٹکڑے لے کر بن رہی تھی، اس کا کوئی ہیولا نہیں ہوا تھا۔ مشرقی ہندوستان کے جو لوگ تھے وہ اودھ کی زبان لکھتے تھے۔ لیکن اب وہ لکھنے کی نہیں صرف بول چال کی زبان رہ گئی۔ اب لے دے کر مسلمانوں نے اس کی سرپرستی کی۔ وہ یہ کرسکتے تھے کہ فارسی یہاں لا دیتے۔ لیکن انہوں

نے ایسا نہیں کیا بہت ہی سوجھ بوجھ سے کام لیا بلکہ کہنا چاہیے کہ رواداری بھی انہوں نے دکھائی۔ مسلمانوں کی اس وقت فارسی زبان تھی اور سارے مشرق کی ڈپلومیٹک زبان۔ لیکن انہوں نے اپنے شعور کی وجہ سے نئی زبان کی سرپرستی کی اور اپنے رسم الخط میں لکھے۔ وہ بنگال گئے تو بنگلہ بھی اپنے رسم اپنے الخط لکھی۔ آپ حیران ہوں گے کہ جنوبی ہند میں جس کو آپ تامل ناڈو کہتے ہیں، وہاں کچھ کتابیں ایسی ملیں ہیں جو عربی رسم الخط میں ہیں۔ انہوں نے کچھ تبدیلی کی تھی۔ جیسے سندھی میں حروف کا اظہار کرنے کے لئے کچھ مخصوص علامتیں وضع کی گئی۔ وہاں بھی کیا تھا، لیکن ان کے پیچھے جو پرانی روایات تھیں وہ سنسکرت میں تھیں۔ جو لوگ تھے اُن کو پیچھے جانے کو موقع نہیں تھا۔ لہذا انہوں نے اسی ہندوستانی زبان کو پکڑا اور اپنے رسم الخط میں لکھنا شروع کیا۔ ان میں سے بہت سے لوگ فارسی جانتے تھے۔ فارسی زبان کو جو خلاء پیدا ہوا تھا، انہوں نے اسی زبان سے پُر کیا۔ اگر یہ نہیں ہوتا تو ممکن تھا پھر وہ فارسی کو ہی جاری رکھتے۔

وحشی سعید - -

تو شاید یہی وجہ ہے کہ ایک خاص ذہنیت رکھنے والوں کی جانب سے اردو رسم الخط کو تبدیل کرنے کے لئے شدومد سے کوشش کی جارہی ہے۔ اس بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

سروری صاحب - -

رسم الخط کے بارے میں کہنا بہت مشکل ہے۔ رسم الخط جو تبدیل ہوگا تو اردو کا کام ہی نہ رہ جائے گا۔ بعض سوجھ بوجھ رکھنے والے ہندی عالم سارے اردو ادب کو ہندی میں منتقل کرنا چاہتے ہیں۔ یہ تو اچھی بات ہے۔ لیکن اگر اس کا مقصد یہ ہے کہ پورا اردو ادب ہندی میں منتقل کرنے کے بعد اردو رسم الخط کو ختم کردیا جائے تو ظاہر ہے کوئی بھی اردو رسم الخط کا چاہنے والا چاہے وہ فراق صاحب ہوں یا راجندر سنگھ بیدی کا چاہنے والا، اس کو نہ پسند کرے گا نہ برداشت کرے گا۔ کیونکہ اس طرح کے عمل کو اردو دشمنی کے علاوہ اور کیا کہا جاسکتا ہے۔ کیونکہ اردو رسم الخط کو ختم کردینے کا

مطلب کہ کچھ ہی دنوں میں اردو زبان کا خاتمہ۔

وحشی سعید ۔ ۔

ایک سوال نئی شاعری کے تعلق سے ہے جناب۔ یہ جو نئی نئی اصناف وجود میں آ رہی ہیں نظم کی اور غزل کی مختلف صورتوں میں، اس تعلق سے آپ کی کیا رائے ہے؟

سروری صاحب ۔ ۔

جب زمانہ بدلتا ہے تو لوگوں کو بھی بدلنا پڑتا ہے، کیونکہ زمانہ بھی ایک طرح سے لوگوں کے بدلنے سے ہی بدلتا ہے۔ ایک بات تو یہ کہی جا سکتی ہے کہ ہندی کے جو اچھے اچھے الفاظ اردو والوں کے سامنے آئیں گے اُن کو لے لیں گے اور میں سمجھتا ہوں کہ ہندی والے بھی ایسا کریں گے۔ اس متعلق میں موجودہ زبانوں کے بارے میں بڑا خوش آئند ہوں کہ آخر کار یہ بھی ترقی کریں گی۔ اب دوسری بات کہ نئی شاعری کے اوزان کیا ہیں؟ بھئی اس میں بڑا گڑبڑ ہے۔ اب آزاد نظم کو لیجئے۔ غالب کے زمانے میں اگر کوئی یہ نظم کہتا تو کیا اس کو نظم کہتے۔ ایک رُخ یہ بھی ہے کہ نئی شاعری کو ترقی پسند لوگ بھی شبہ کی نظر سے دیکھتے ہیں کہ اس میں کچھ ہے بھی یا نہیں۔ ترقی پسند تحریک بحثیت ایک زندہ تحریک کے وہ ختم ہوگئی۔ لیکن وہ جو اس روایت میں پرورش پائے، مثال کے طور پر سردار جعفری اور کچھ نام بھی گنے جا سکتے ہیں۔ موجودہ لکھنے والے جو نئی شاعری سے تعلق رکھتے ہیں، ان حضرات کا رویہ بہت مشکوک ہے ان کے بارے میں۔ لیکن وقت اور زمانے کے بدلنے کا اثر ہر شئے کے ساتھ ادب پر بھی لازمی ہے۔

وحشی سعید ۔ ۔

اچھا سروری صاحب۔ آپ کو اردو ادب میں کس افسانہ نگار نے سب سے زیادہ متاثر کیا ہے اور کیوں؟

سروری صاحب ۔ ۔ (مسکراتے ہوئے)

یہ آپ نے اپنے مطلب کا سوال پوچھا ہے۔ مجھے سب سے زیادہ پریم چند نے متاثر کیا۔

وحشی سعید: ان کے بعد سروری صاحب

سروری صاحب ۔ ۔

ان کے بعد مجھے کرشن چندر نے متاثر کیا۔ اُنہوں نے بہت لکھا۔ اُن کے بعض افسانے، افسانے ہی ہو کر رہ گئے۔ ان میں اپج ہے۔ کیوں متاثر کیا، اس کا جواب یہ ہے کہ کرشن چندر کے کہانی لکھنے کے ڈھنگ نے، گُر نے جس کو آپ تکنیک کہتے ہیں، آرٹ کہتے ہیں۔ اس کو برقرار رکھتے ہوئے کرشن چندر نے اپنے اطراف کی زندگی کو اس آرٹ، اس گُر اور اس خوبی کے ساتھ پیش کیا ہے جس کی زبان نہ بہت گھٹیا قسم کی ہے جسے آپ بہت عوامی کہتے ہیں۔ پڑھے لکھے آدمی کے لئے جیسی زبان ہونی چاہیے ویسی ہی زبان میں افسانے لکھے ہیں۔ اور پھر یہ بھی نہیں کہ وہ خیال کے لحاظ سے بہت سپاٹ ہیں۔ کچھ تو ایسے افسانے ہیں جو بہت ہی سپاٹ نہیں ہیں۔ کچھ تو ایسے افسانے ہیں جن میں خیال کی گہرائی ہے جس کو پڑھ کر انسان سوچنے لگتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ وہ کچھ مثالی نہیں ہیں۔ اس کے باوجود واقعات بیان کر دیتے ہیں ۔ ان سے ایسا لگتا ہے کہ یہی واقعات ان کا مقصد نہیں ہے کہ اس کی تہہ میں بھی کوئی بات ہے جس کو وہ کہنا چاہتے ہیں۔ اس واسطے میں ان کو پسند کرتا ہوں۔ اس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ ایسے افسانے لکھنے والے موجودہ دور میں نہیں ملتے۔

وحشی سعید ۔ ۔

سروری صاحب کہا جاتا ہے کہ جدید اردو نے روایت سے بغاوت کی۔ آپ کا کیا خیال ہے؟

سروری صاحب ۔ ۔

اس کے بارے میں، میں یہ کہوں گا کہ حدیث بے خبراں، قصہ جدید وقدیم کا نہیں ہے۔ اگر آپ صوفی کی نظر سے دیکھئے تو ہر آن دنیا بدل رہی ہے۔ اس واسطے یہ تو سلسلے ہیں۔ میرے ذہن میں اس جدید اور قدیم کا تصور نہیں آتا۔ اس کا ایک سبب یہ ہے کہ میری تربیت علمی زبان میں ہوئی۔ علمی زبان کے لحاظ سے آدمی یہ کہتے ہیں ۔ ۔ ۔ عجیب وغریب بات ہے، آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی۔ کہتے ہیں کہ ہر شخص اپنی زبان آپ پیدا کرتا ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ آپ زبان کو جس طرح استعمال کرتے ہیں، اُس طرح میں استعمال نہیں کرتا۔ ہر آدمی اپنے طریقے سے زبان لکھتا اور بولتا ہے۔ حالؔی اور سرسید ایک ہی زمانے کے لکھنے والے تھے لیکن لکھنے کے انداز میں کتنا فرق ہے۔ اب جو نئے انداز اردو ادب میں بنے ہیں، طبیعت خوش ہوتی ہے نئے لکھنے والوں کے نئے انداز پڑھ کر۔ تنقید کے لحاظ سے سید احتشام حسین اور آل احمد سرور جس طریقے سے لکھتے ہیں وہ حالؔی کے مقابلے میں کتنے نئے لگتے ہیں۔ ایسا سلسلہ وار ہوتا آیا ہے اور ہر وقت تبدیلی ہوتی ہے جس کو میں نہ قدیم کہوں گا نہ جدید اور نہ روایت سے بغاوت۔

وحشی سعید ۔ ۔

آپ نے مجھ طالب علم سے اردو ادب کے اتنے اہم موضوعات پر گفتگو کر کے جو میری حوصلہ افزائی فرمائی ہے میں یہی دعا کروں گا کہ آپ جیسا شفیق استاد ہر طالب علم کے نصیب کی زینت ہو۔ بہت بہت شکریہ۔



نئی سمتوں کی تلاش

(مرحوم حکیم منظور پر خاص مضمون)

یہ یاد کب تھا کہ تم بھی ہو دورِ نو کے اسیر
تمہارا دل بھی خلوص و وفا سے خالی ہے

اوپر کا شعر میرے شاعر دوست نے ہمارے ایک مشترک دوست کے ناروا سلوک پر فی البدیہہ کہا۔ ہر شاعر جذباتی ہوتا ہے مگر جذبات پر قابو پانا اور پھر اُن جذبات کو حکیمانہ رنگ دینا ایک باکمال شاعر کی خصوصیت ہوتی ہے۔ کسی نقاد نے کہا کہ زندگی جذباتی اور حساس آدمی کے لئے ٹریجڈی ہے اور ایسے آدمی کے لئے جو جذباتی اور حساس ہونے کے علاوہ ذی فہم بھی ہو، کامیڈی ہے۔ زندگی میرے شاعر دوست کے لئے ابھی ٹریجڈی ہے اور جس دن اس ٹریجڈی میں عقل وفہم شامل ہوگی، اُس دن وہ بلاشبہ باکمال شعرا کی صف میں کھڑا ہوگا۔

اپنا ضمیر سب کو دکھاتا ہے آئینہ
بننے کو کوئی لوگوں میں کچھ بھی بنا کرے

منصف ہیں مطمئن مجھے انصاف مل گیا
اوروں کے جرم نام پہ میرے لکھے گئے

مگر ایسے اشعار اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ شاعر موصوف اُس راہ پر گامزن ہیں جہاں شاعر کو معراج عطا ہوتی ہے۔ غزل کو جو نیا مزاج جدید شعراء نے دیا، وہاں داستان زندگی داستان غزل بن گئی۔

حکیم کی گفتار میں زندگی کے تلخ حقائق اور حوادث کی داستاں موجود ہے۔ موصوف شاعر کا اصلی نام محمد منظور ہے، لیکن حکیم منظور کہلانا پسند کرتے ہیں۔ منظور ہی تخلص بھی رکھتے ہیں ؎

کہیں جو عظمت دار و رسن کی بات چلی
ہر ایک صاحب کردار ہوگیا خاموش

تو اپنے صبر کو حسن سخن کا نام نہ دے
یہ سچ کہ تونے زمانے کو کردیا خاموش

نظر نظر میں ہے آسیب تیرگی منظورؔ
عجب گھٹن ہے یہاں ہے دیا دیا خاموش

ان اشعار کا مطالعہ کرنے کے بعد اسلوب اور موضوع کا خیال فوراً ذہن کو اپنی گرفت میں لیتا ہے۔ اسلوب اس بات کا پتہ بتا دیتا ہے کہ شاعر کا قابو زبان پر کس حد تک ہے؟ کیا وہ الفاظ کے نشست و برخاست پر اور ترتیب پر دھیان دیتا ہے۔ جہاں تک الفاظ کے ترتیب اور نشست برخاست کا تعلق ہے منظور کا پورا دھیان رہتا ہے۔ وزن اور بحر کا استعمال بخوبی ہوتا۔ ہاں خاص اور چونکا دینے والی بات جو اشعار میں سامنے آتی ہے وہ لفظ ''خاموش'' جو ردیف کے طور پر استعمال ہوا ہے، وہ قابل تعریف بھی ہے اور قابل غور بھی ہے۔

ضمیر ہوتا نہ زندہ اگر میرا منظورؔ
قلم کی بات نہیں دل بھی بیچتا شاید

منظورؔ نے اس شعر میں دورِنو کی وہی حقیقت بیان کی جہاں قلم ہی نہیں دل بیچا جاتا ہے۔ وہ سیلف میڈ آدمی ہے۔ اپنی شخصیت کو خود اپنے ہاتھوں سے تعمیر کرتا ہے۔ 17 جنوری 1937ء سرینگر میں ہی جنم لیا۔ یہاں کی حسین فضاؤں نے اس کی شوخ شخصیت کو تعمیر کرنے میں بہت حد تک مدد دی۔

ایف۔اے تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد 1955ء میں سرکاری نوکری اختیار کی۔اس سرکاری نوکری میں بھی اُتار چڑھاؤ کی لمبی کہانی موجود ہے۔ایسے وقت وہ یہ کہنے پر مجبور ہوتے ہیں ۔

مجھ ہی سے جرم ہوا میں نے سچ کہا شاید
کہ ناروا کو کہا میں نے ناروا شاید

ایک ایسا شخص اُن کی شاعری میں مرکزی حیثیت رکھتا ہے جو وحشی ہے، وہ اس کا محبوب بھی ہے اور پیارا بھی ہے۔مگر جہاں کوئی خامی اس کے اپنے محبوب میں نظر آئی ، وہ کہنے سے گریز نہیں کرتا ہے۔

ایسا وحشی کہ بصد شوق سلاسل مانگے
میں وہ سقراط جو خود زہر ہلال مانگے

وہ کہ ساحل پہ جو طوفاں بپا کرتی ہے
خود جو طوفاں میں گر جائے تو ساحل مانگے

کون بکھری ہوئی یادوں کو سمیٹے منظورؔ
کون گزرے ہوئے لمحات کا حاصل مانگے

وجود کا سب سے بڑا کرب یہ ہے کہ خود آئینہ آدمی کو اجنبی کی طرح دیکھے۔یہی نہیں بلکہ دل کو ٹھیس لگتی ہے جب آدمی آدمی معلوم نہیں ہوتا ہے اور اس دور کا ایک ایک لمحہ صدی لگتا ہے۔یہی تلخ حقائق منظور اپناتا ہے اور اپنی شاعری میں یہی بیان کرتا ہے ۔

ذرا قریب جو پہنچا تو دل کو ٹھیس لگی
مجھے دکھائی دیا تھا وہ آدمی کی طرح

میرے وجود کا بس اتنا کرب ہے یارو
کہ آئینہ مجھے دیکھے ہے اجنبی کی طرح

یہ دور وہ ہے کہ حساس دل پہ اے منظورؔ
ایک ایک لمحہ گزرتا ہے اک صدی کی طرح

کسی کسی جگہ منظورؔ کی شاعری میں تمثیلی رنگ عروج پر پہنچ جاتا ہے۔ اس تمثیلی رنگ میں جدیدیت کا رنگ بھی کارفرما ہے۔ ایسی جگہ شاعر خالص انفرادی رجحان میں زندگی کو دیکھنے کی کوشش کرتا ہے۔

ملا جب سے دل کا اُجالا مجھے
یہ سورج بھی لگتا ہے کالا مجھے

چمک میری اُس سے نہ دیکھی گئی
اسی واسطے توڑ ڈالا مجھے

عجب ہے کہ اتنی بڑی کائنات
دکھائی دے مکڑی کا جالا مجھے

جہاں جہاں منظورؔ کی شاعری روحانی پس منظر میں اُبھرتی ہے وہاں وہ میرؔ کے بہت قریب ہو جاتے ہیں۔ وقت کا انتظار کرنے والا یہ شاعر ماضی میں آنے والے مستقبل کا بھی انتظار کرتا ہے۔ یہ انتظار کٹھن بھی ہے اور دشوار بھی ہے، مگر منزل کی آخری سرحد ہے۔

تیرے خلوص کا قائل تو ہوں مگر مجھ کو
یہ پُرشش غم دل بے سبب دکھائی دے

وہ آفتاب نمودار ہو جو مغرب سے
ہر ایک سوچ رہا ہے کب دکھائی دے

جب بھی کل اور جُز کے فلسفے میں شاعر کھو جاتا ہے وہاں اُس کے لئے مسئلہ ہی عجب دکھائی دے۔ دراصل یہاں پر شاعر جستجو کی منزل سے گزر رہا ہے۔ وہ پختگی کی سرحد پر کھڑا ہے مگر پاؤں کے نیچے نیم پختہ زمین ہے۔ دراصل جس لمحے وہ پختگی کی زمین پر قدم ڈالے گا تب اُس کے لئے کُل اور جُز کا مسلہ عجب دکھائی نہیں دے گا ۔

میں کل ہوں یا جُز ہوں میں کیا کہوں منظوؔر
یہ مسلہ ہی مجھے کچھ عجب دکھائی دے

جیسے ہی کوئی اسرار بن جاتا ہے وہ باہر سے چھپ جاتا ہے مگر اندر دکھائی دیتا ہے۔ اس لمحے نگاہِ بے محابا چاہیے اس خوبی کو جس انداز سے منظوؔر نبھا لیتے ہیں۔ وہ اُن کی پختگی کا پتہ ضرور بتا دیتا ہے مگر وہ منزل نہیں جس کو پختگی پر قابو کا نام دیا جائے ۔

ڈھونڈو مجھے کہ میں بھی ہوں اسرار کی طرح
باہر سے چھپ گیا ہوں تو اندر دکھائی دوں

اُن کے کلام میں کچھ ایسے اشعار بھی ملتے ہیں جو دعوت غور و فکر دیتے ہیں ۔

جب سے آئینہ لئے رہنے لگا ہوں بزم میں
اُٹھ رہی ہے ہر نظر میری طرف بپھری ہوئی

اس میں اے منظوؔر تھا میرا بھی ایک چھوٹا سا گھر
یہ جو بستی دیکھتے ہو دور تم اُجڑی ہوئی

غالبؔ کے کلام کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے کہ اس کے کلام میں ابہام اور پیچیدگی ملتی ہے۔ ابہام والے اشعار فوراً غالبؔ کی یاد دلاتے ہیں۔ مگر منظوؔر کے کلام میں ایسے اشعار نہیں ملتے ہیں جن میں ابہام ہو، پیچیدگی ہو۔ کچھ ایسے اشعار بھی اُن کے کلام میں ملتے ہیں جن میں کسی حادثہ کا

ردعمل ملتا ہے۔ ایسے اشعار دل کو چھو جاتے ہیں تقسیم ہند پر ایک شعر ملاحظہ ہو ۔

جب سے ہم نے اپنے اپنے گھر بنا ڈالے الگ
تم بھی بے گھر ہوگئے اور میں بھی بے گھر ہوگیا

منظوؔر کا یہ شیوہ نہیں ہے کہ وہ اُمید کا دامن چھوڑ دے۔ وہ شب کی تاریکی کے بعد صبح خوش آثار کا انتظار کرتا ہے ۔

مظہر اس بات کا یارو ہے شب تار کا رنگ
ہم بھی دیکھیں گے کبھی صبح خوش آثار کا رنگ

ارباب خرد مصلحت کوش ہوتے ہیں اس لئے وہ گفتار کا رنگ بدل دیتے ہیں ۔

مصلحت کوش ہوا کرتے ہیں ارباب خرد
وقت کے ساتھ بدل دیتے ہیں گفتار کا رنگ

ذکر عشق اُن کی شاعری میں بہت کم ملتا ہے۔ مگر جب بھی اس تجربے کا بیان ہوتا ہے، وہاں وہ جدا انداز بیان اختیار کرتا ہے ۔

ہائے وہ حسن ادا اور میرا حسن یقیں
اُن کے انکار میں بھی پایا ہے اقرار کا رنگ

منظوؔر نے کچھ نظمیں بھی لکھیں ہیں۔ لیکن اُن کی صنف غزل ہے۔ غزل کی نبض و مزاج سے پوری طرح واقف ہیں۔ نئی زمینوں میں نئی بات کہہ جاتے ہیں۔ یہی انفرادیت اُن کے لئے ادب میں مخصوص جگہ بنارہی ہے ۔

کسی دن میرے انا کو کہیں گے نہ جرم لوگ
کسی دن اُٹھے گا نیند سے انصاف کا خدا

اور

جس کا جواب ہوتا ہے خود اِک بڑا سوال
یہ دورِ بے حسی ہے وہ چبھتا ہوا سوال

پوچھا تھا کیا ہے حاصل ارمان و آرزو
آوارہ پھر رہا ابھی تک میرا سوال

جب منظوؔر سے دل بھی کوئی ٹیڑھا سوال پوچھتا ہے تو وہ بھی جواب نہیں دے پاتا ہے۔ کیسا خدا کہاں کا خدا کون خدا اس کے لئے بھی سوال ہے ۔

منظوؔر مجھ سے پوچھتا ہے دل یہ بار بار
کیسا خدا کہاں کا خدا کون سا خدا

کبھی کبھی وہ بازار کا رنگ دیکھ کر مہر بہ لب ہو جاتے ہیں ۔

اب یہاں کوئی وفاؤں کا خریدار نہیں
ہم بھی ہیں مہر بہ لب دیکھ کے بازار کا رنگ

منظور کے کلام میں یہ خوبی عیاں ہے کہ وہ فن کا لحاظ رکھتے ہیں۔ بلاشبہ اس کا مستقبل روشن ہے۔ کیونکہ منظور کو یہ حقیقت معلوم ہے کہ ایک زمانے سے جدا ہے اس کی گفتار کا رنگ ۔

مجھ کو دعویٰ تو نہیں ہے یہ حقیقت منظوؔر
اک زمانے سے جدا ہے میری گفتار کا رنگ

☆ ☆

مظفر ایرج کے ساتھ میری پہلی شناسائی

ڈالتے ہیں وہ بھی مجھ پر اپنے احسانوں کا بوجھ
کچھ ہی دن پہلے میری جن سے شناسائی ہوئی

یہ شعر میرے دوست شاعر نے میری گاڑی میں بیان کیا، لیکن حکیم منظور کا کہنا تھا کہ یہ شعر اُن کے لئے موصوف نے کہا ہے کیونکہ اُن سے موصوف کی کچھ دنوں کی شناسائی ہے۔ مگر خود موصوف کا کہنا ہے کہ یہ شعر میرے لئے کہا گیا۔ بہر حال اُس نے کس کے لئے کہا اُن کا دل واقف ہے۔ شاعر کو احساس کا بوجھ گوارا نہیں ہے۔ اس لئے یہ دلیل واضح ہو جاتی ہے کہ شاعر جذباتی ہے اور یہی شدید جذباتیت شاعر کی شخصیت میں دورُخی پن پیدا کرتا ہے۔

مظفر نقش بندی تخلص ایرج کاشمیری نے جنونِ شوق میں صنف شاعری پر چار سال پہلے طبع آزمائی شروع کی۔ نو جوان ہے، ابھی اس پتھریلی دنیا کے اُتار چڑھاؤ میں پس جائے گا۔ شاعری کی وہ پختگی جو عروج کہلاتی ہے حاصل ہو گی۔ پیشہ شاعری نہیں، فن کو فروخت کرنے کا اصول نہیں، چار پیسے مل جائیں انکار نہیں۔

غزل کے لب و عارض میں غازہ لگانا ان کی شاعری کی ابتداء ہے۔ ابتدائی شاعری میں تقلید اچھی بات ضرور ہے، لیکن رسمی شاعری میں جدا راہ تلاش کرنا ایک خوبی ہے۔

ہم متفق ہیں شیخ سے ملئے حرام شے
ہاتھوں پہ اختیار نہ آئے تو کیا کریں

تیرے جانے کا مانا غم نہیں ہے
خدا شاہد ہے پھر بھی کم نہیں ہے

جمعرات 29 رفروری 1944 میں پیدا ہونے والا یہ کشمیری شاعر قد کا چھوٹا ہے، پتلا ہے، رنگ گندمی ہے اور پہلی نظر میں ان کی شخصیت کسی فرد کو متاثر نہیں کر پائے گی، مگر جب اِن کا درِ خیالات کھل پڑے گا تو اس مہیب شخصیت کی ایک اور ہی تصویر یہ سامنے آئے گی ؎

غور سے وقت کے شیشے میں جو جھانکا ہم نے
اپنی تصویر بھی خوود ہم کو نظر آئی مہیب

خالص تقلیدی رنگ کب تک باقی رہے گا۔ یہ وقت مقرر کرنا میرے لئے مشکل ضرور ہے لیکن یہ کہنا ناممکن نہیں ہے کہ پچھلے چند مہینوں میں کسی نئ صحبت کی وجہ سے ان کی شاعری میں تقلیدی رنگت غائب ہو رہی ہے اور ان کی اپنی انفرادیت اُبھرتی ہوئی نظر آتی ہے ؎

اس شہر میں پابند اُلفت ہی نہیں کوئی
ہم پھر بھی غنیمت ہیں سینے سے لگا ہم کو

وہ کہہ گیا مجھے طوفان آشنا کر کے
غم حیات کی لہروں پہ ڈھول آہستہ

مگر اس حقیقت کا مجھے اعتراف ہے کہ نئ صحبت سے پہلے ہی وہ پرانے راستے کو ترک کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ پوسٹ ڈپلوما ہینڈلوم ٹیکنالوجی کی ڈگری رکھنے والا یہ شاعر بنارس کے اُس علمی ماحول سے بہت زیادہ متاثر ہوا جہاں کے حسینوں پر غالبؔ نے کسی زمانے میں مثنوی لکھی تھی۔ اس ہی شہر سے ایرج نے ڈگری حاصل کی۔ اس حقیقت کا اعتراف کرنا ضروری بن جاتا ہے کہ نئ صحبت سے پہلے وہ پرانے راستے کو ترک کرنے کا ارادہ رکھتا تھا اور نئ صحبت نے اس ارادے پر

سونے پہ سہاگہ کا کام کیا۔ اس درمیانی واقفے کے چند اشعار سے صاف ظاہر ہو جائے گا کہ شاعر ایک کشمکش سے گزر رہا ہے ؎

کرب احساس کا لمحات میں ڈھل جائے گا
وقت بے رحم سہی وقت بے ٹل جائے گا

اہل نظر سے پوچھ کے دیکھ دل والوں کی بات کوئی
بغلیں جھانکتے رہ جائیں گے خود کو سمجھنے والے گھر

نئی راہ کی تلاش میں بے چینی قابل تحسین ہے۔ کبھی کبھی اس قفس سے آزاد ہونا بڑا کٹھن ہوتا ہے اور شاعر جمود کا شکار ہو کے رہ جاتا ہے۔ ایسی حالت شاعر کے لئے نہایت خطرناک ہوتی ہے۔ اُس کا لاوا اُبلنے سے پہلے سرد ہو جاتا ہے مگر ایرجؔ نے اس مشکل پر نہایت خوبی کے ساتھ قابو پایا۔

جسے بھی دیکھئے محروم دولتِ احساس
بجائے دل لئے پھرتے ہیں لوگ اب پتھر

اپنے کاندھوں پہ اُٹھائے ہوئے احساس کی لاش
اپنی خواہش کا تو ایرج بھی ہے درپردہ رقیب

روشنی کا فریب کھاتے ہیں
جو اندھیروں سے روشناس نہیں

اور یہ شعر خاص توجہ کے قابل ہے ؎

کم ظرفی پہ سب اس کی ہنستے ہیں نہ جانے ہیں
کس درد سے گزرے ہے فوارہ اُچھلنے تک

میرے تئیں جدیدیت کا مفہوم دراصل چھوٹی بات میں بھی اُس اہمیت کا احساس دلانا ہے جو بڑی بات سے پیدا ہوتی ہے۔ بالا شعر اس ہی چیز کا ترجمان ہے۔

فکرِ معاش انسانی نفسیات، خیالات اور سوچ کے ڈھنگ میں قدرے تبدیلی لاتی ہے۔ ایرج کے ساتھ اس سلسلے میں آنکھ مچولی ہوتی ہے۔ کبھی ایک نوکری چھوٹ گئی کبھی دوسری۔ شاید اس لئے اُس کے لاشعور میں یہ خیال ہر وقت ساتھ رہا ۔

الجھا ہوں اس طرح سے غم روزگار سے
دامن بھی چاک چاک گریبان بھی تار تار

ہاں وہی لمحہ تیری ذلت کا رسوائی کا ہے
جب کسی اپنے سے غم اپنا بیان کرنا پڑا

اور کبھی کبھی ایسی حالت انسان کو حال سے بیزار بنا لیتی ہے اور مستقبل کا دلدادہ بھی نہیں رہنے دیتی ۔

وقت نے انسان کو ایرجؔ کتنا بے حس کر دیا
حال سے بیزار مستقبل کا دلدادہ نہیں

بدلتی ہوئی دنیا کا احساس سائنسی رجحان نے جو قدروں میں تضاد پیدا کیا، وہ بہر حال شاعر پر اثر ڈال کے جاتا ہے۔ اس اثر سے ایرج بھی محفوظ نہیں ہے۔ حقیقت پہچان لینے سے گریز نہیں کرتا ہے ۔

وقت نے ایسی کروٹ بدلی تشبیہوں کا خون ہوا
چاند بچارہ خود ہی کھنڈر کہے کسے ایک چاند سا چہرہ

نظموں کا کارنامہ ایرجؔ کی شاعری میں اہمیت کے قابل نہیں ہے لیکن ذکر سے خارج کرنا ناممکن ہے۔ ''شیشے کے دل''، ''احساس شاعر کا''، ''خلا نورد اور چاند''، ''تصور کا طلسم''، ''تعارف''،

''فاصلے''، ''اُلٹی تصویریں''، ''آسیب'' اور ''ایک رچ'' متاثر ضرور کر جاتی ہیں مگر وہ اُٹھان موجود نہیں ہے جو جدید نظموں کے لئے ضروری ہے۔ ''شیشے کے دل'' متاثر کر لیتی ہے مگر فوراً اقبال یاد آتا ہے۔ یہاں ایرجؔ نہ صرف اقبال کی تقلید کرتے ہیں بلکہ لاشعور میں اقبال کا خیال بھی کارفرما ہے۔ کبھی داؤد کے نغموں میں اپنا یار دیکھا۔

ایرجؔ کی یہ خصوصیت بڑی متاثر کرتی ہے کہ وہ کبھی کبھی معمولی بات بڑے لطیف اور سادہ انداز میں کہہ جاتے ہیں۔ ایسے لمحے میرؔ کی یاد آجاتی ہے اور ایرجؔ کے سادہ اشعار دل کی گہرائیوں کو چھوجاتے ہیں ؎

یا دل کی بات کر یہاں یوسف کا نہیں کام
یہ پریم کی نگری ہے نہیں مصر کا بازار

خیال جب وقت کی بھٹی میں مل کر راکھ بن جاتا ہے تو اس میں آفاقی رنگ پیدا ہوتا ہے اور وہی آفاقی رنگ شاعری کی عظمت ہے۔ ایسا آفاقی رنگ وقت چاہتا ہے اور ابھی وہ وقت ایرجؔ کی شاعری کو درکار ہے۔ مگر اس بات کا اس کو ہر وقت احساس ہے کہ اس کے پاس قلم ہے اور جب تک اس کے پاس قلم ہے تب تک اس کو بال و پر نوچ لینے کا بھی غم نہیں ہے۔

نہیں غم گر فلک نے نوچ پھینکے بال و پر میرے
ابھی تک تو نہ قابو کرسکا میرا قلم کوئی

حقیقت کا احساس ہر وقت پاس رہنا شاعر کے لئے بڑی دین ہے۔ وہ زمانہ تک جب عارضی دنیا کی رنگینیوں میں آدمی کھو کر غم دل کو مسرت اور خوشی خیال کرتا ہے۔ مگر ایرجؔ اس بات سے پوری طرح واقف ہے کہ خواب بہرحال خواب اور حقیقت حقیقت ہے۔

دشوار ہے اسے یا خواب بتانا

اور خواب دکھانا تو بڑی بات نہیں ہے

زندگی ایک طبعی زنجیر ہے جس کی گرہ کھولنے میں ناخن تدبیر کی ضرورت ہوتی ہے اور اس ضرورت میں حواس بہرحال قائم رکھنا ضروری ہے۔ چند دنوں کی شہرت اور واہ واہ، یہ تو عظمت کا ثبوت ہے نہ ہی نشان دہی، البتہ حوصلہ افزائی کی پہلی نشانی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہر آنکھ پر بھروسہ نہ کیا جائے، کیونکہ بقول ایرجؔ خود ؎

اپنی کہانی کہہ لینے پر ایرج کو محسوس ہوا یا تو

یہاں ہر آنکھ ہے اندھی ، یا تو یہاں ہر کان ہے بہرا



گفتگو

-- پروفیسر حامدی کاشمیری اور وحشی سعید کے درمیان

وحشی سعید :

آپ نے اردو تنقید میں ایک نئی اصطلاح اکتشافی تنقید کے طور پر متعارف کی۔ حامدی صاحب کیا آپ اس کی وضاحت فرمائیں گے؟

حامدی کاشمیری :

مارچ 1982ء میں میری کتاب ''کارگہہ شیشہ گری'' شائع ہوئی، جس میں، میں نے معاصرین کو یہ کہہ کر چونکا دیا کہ میں نے کلام میرؔ کا مطالعہ ایک نئے اور منفرد نظریہ نقد کی روشنی میں کیا ہے جسے میں نے ''اکتشافی تنقید'' سے موسوم کیا۔ میرؔ اور میرؔ کے کلام پر پہلے ہی گوپی چند نارنگ اور شمس الرحمٰن فاروقی وغیرہ نے تجزیاتی مطالعہ کرکے ان کے متعدد معانی کا پتہ لگایا تھا۔ لیکن میں نے معاصرین سے الگ ہوکر شعر سنجی کی ایک نئی راہ نکالی اور اس کے تحت میرؔ کے کلام کا جو عمیق مطالعہ کیا اُس سے میرؔ کی عظمت کے نقوش روشن ہوگئے۔ اس ضمن میں، میں نے ''کارگہہ شیشہ گری'' کی ابتدائی بات ''دریائے سخن'' میں لکھا ہے کہ شاعری بنیادی طور پر ایک طلسم کارانہ تخلیقی فن ہے۔ شاعر لفظ و پیکر کے علامتی برتاؤ سے تجربات کے طلسم کدے تخلیق کرتا ہے۔ ان طلسم کدوں تک عام قاری کی رسائی ممکن نہیں۔ اس لئے ایک صاحبِ نظر نقاد کی رہنمائی ناگزیر بن

جاتی ہے۔ چنانچہ نقاد اپنی نازک ہیئت، بصیرت، لسانی شعور اور گہرے ادراک سے کام لے ان طلسم کدوں کے جادوئی درازوں کو وا کر کے اسراری جلوؤں کی شناخت کرتا ہے اور انہیں قاری پر ارزاں کرنے کی ذمہ داری قبول کرتا ہے۔ چنانچہ ان جلووں کو دیکھنا اور دکھانا اس کے فرائض منصبی میں شامل ہو جاتا ہے۔ اس نوع کی تنقید جسے میں اکتشافی تنقید سے موسوم کر رہا ہوں، کی ضرورت اور اہمیت کا احساس اردو ہی کیا یورپی زبانوں میں بھی تقریباً ناپید ہے۔ اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم موجودہ تنقیدی نظریات کی حد بندیوں اور کوتاہیوں کا احساس کر کے تنقید کے حقیقی رول کو پہچانیں۔ اکتشافی تنقید کا تفاعل جیسا کہ نام سے ہی ظاہر ہے فن پارے کی تخیلی دنیا میں مستور حیرت زاد وقوعات کی شناخت کرنا ہے اور پھر قاری کو ان کی تازگی، ندرت اور جمالیاتی معنویت کا احساس دلانا ہے۔

وحشی سعید :

ڈاکٹر اشرف آثاری نے میرے ایک حالیہ افسانہ ''ارسطو کی واپسی'' کا تجزیہ کرتے ہوئے ایک نئی اصطلاح ''بازگوئی'' کا حوالہ دیا ہے جس میں کسی پرانے اساطیری واقعے کو نئے یا عصر حاضر کے واقعے سے جوڑ کر افسانے کا تانا بانا بنا جاتا ہے۔ آپ بحیثیت ایک فکشن نگار، نقاد اور شاعر کے اس اصطلاح پر کچھ فرمائیں گئے۔

حامدی صاحب :

بازگوئی جیسا کہ آپ نے بھی فرمایا، کسی پرانے اساطیری واقعے کو موجودہ تناظر میں پیش کرنے یا واقعات کے ساتھ جوڑنے کو کہتے ہیں۔ اردو کے معروف فکشن نگار انتظار حسین کو اس فن میں اچھی مہارت حاصل تھی، بلکہ اگر یوں کہا جائے کہ انتظار حسین اپنی اسی روش یا طرز تحریر سے مشہور ہو گئے تو شاید بے جا نہ ہوگا۔

آپ کی فکشن نگاری پر میں اس سے قبل بھی لکھ چکا ہوں، جو چھپ چکا ہے۔ خاص طور پر آپ کی

علامت نگاری پر۔ آپ کے علامتی پیرایۂ اظہار، آپ کا منفرد بیان واسلوب اور پھر مروجہ اردو افسانے کے اجزائے ترکیبی سے سبھی بخوبی واقف ہیں۔ مجھے خوشی ہے کہ آپ نے اردو فکشن نگاری میں وہ مقام ومرتبہ حاصل کرلیا ہے جس کے آپ مستحق تھے۔ جہاں تک آپ کے تازہ افسانے ''ارسطو کی واپسی'' کا سوال ہے، میں اس پر فکر انگیز تجزیہ پیش کرنے والے ڈاکٹر اشرف آثاری کے خیالات سے متفق ہوں کہ یہ ''ارسطو کی واپسی'' بازگوئی کا ایک عمدہ افسانہ ہے۔ امید ہے اردو قارئین بھی اسے پسند فرمائیں گے۔

وحشی سعید :

حامدی صاحب جموں وکشمیر کی سرکاری زبان اردو ہے لیکن اس زبان کو سرکاری سرپرستی حاصل نہیں ہے۔ اس سب کے باوجود کیا آپ کشمیر میں اردو کے مستقبل سے مطمئن ہیں؟

حامدی صاحب :

جو کچھ ہونا چاہیے تھا، نہیں ہوا ہے اور نہ ہو رہا ہے۔ سرکاری ادارے کام کر رہے ہیں، لیکن تسلی بخش طور پر نہیں۔ لیکن پھر بھی میں مطمئن ہوں کہ اردو زبان بہت سخت جان ہے، قائم ودائم رہے گی کہ اسے خدانخواستہ ختم نہیں کیا جاسکتا۔ لاتعداد اہل ثروت حضرات ہیں جو اس زبان کی مختلف طریقوں سے خدمت انجام دے رہے ہیں، اُن میں آپ بھی ہیں کہ آپ ''نگینہ انٹرنیشنل'' پر زر کثیر صرف کرکے باقاعدگی کے ساتھ اسے منظر عام پر لاتے ہیں اور مختلف طریقوں سے اردو زبان وادب کی خدمت میں مصروف ہیں۔



فن کار اب بھی مستور ہے

(ایک ادبی گفتگو)

(مدیر ''ماہنامہ شاعر''، ممبئی ۔ ۔ جناب افتخار امام صدیقی نے ''شاعر'' کے خصوصی گوشہ کے لئے وحشی سعید سے جو انٹرویو کیا تھا، یہاں وہ پیش کیا جا رہا ہے)

س) سب سے پہلے تو آپ اختصار کے ساتھ اپنا ادبی پس منظر بیان کیجئے۔

ج) ایس پی کالج میں زیر تعلیم تھا۔ کالج میگزین کے اردو حصے میں لکھا کرتا تھا۔ اسی دوران ایک افسانہ آپ کے گراں قدر ماہناہ ''شاعر'' میں چھپا جو آپ کے والد مرحوم اعجاز صدیقی صاحب کی زیر ادارت شائع ہوتا تھا۔ شاعر جیسے رسالے میں افسانے کی اشاعت بہت بڑی بات تھی۔ کالج سے پھر کشمیر یونیورسٹی میں آ گیا۔ عبدالقادر سروری، ڈاکٹر شکیل الرحمٰن اور پروفیسر حامدی کاشمیری صاحب جیسے مشفق استاد مل گئے جن کی حوصلہ افزائی نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا۔ اس طرح سے میرے اردو ادبی سفر کا آغاز ہوا، جو الحمدللہ آج تک جاری ہے۔

س) ۔ آپ کی نسبت سیمابی ہے، اس بارے میں آپ خود بیان کیجئے کہ کس طرح آپ سیمابی ہیں؟

ج) حرکت ہی زندگی ہے اور جمود موت۔ اب جو شخص جتنا متحرک ہوگا اُتنا ہی سیمابی صفت

کا بھی۔ زندگی کے نشیب وفراز بھی انسان کی رہنمائی کرتے ہیں۔ میری عادت ہے میں ہمیشہ اپنے آپ کو متحرک رکھتا ہوں۔ ضخیم ادبی رسالہ ''نگینہ انٹرنیشنل'' کی ادارت، فکشن نگاری، دوست احباب کے ساتھ مل بیٹھ کر یا پھر سیر وتفریح وغیرہ میں۔ کبھی کبھار حیرت ہوتی ہے کہ میں اس عمر میں بھی یہ سب کیسے کر پاتا ہوں لیکن کوئی ہے جو مجھ سے یہ سب کرواتا ہے۔ میری سیمابی طبیعت بھی اس کی معاونت کرتی ہے۔

س) آپ کا لائقہ وحشی کی اصل وجہ کیا ہے؟

ج) الانسان حیوان الناطق اشرف المخلوق کو حیوان (سمجھ دار) بھی کہا گیا ہے اور حیوان وحشی ہو سکتا ہے۔ گزارش یہ ہے کہ ''وحشی'' کو بندھے ٹکے مفاہیم کے تناظر میں نہ لیا جائے۔ یہ لفظ بھاگنے والے، گھبرانے والے، ایک حال پر نہ رہنے والے، مضطرب جیسے دل وحشی کے مفاہیم میں بھی استعمال ہوتا ہے جو سب انسان کی خصائل کی دلالت بھی کرتے ہیں۔ مذکورہ جملہ خصائل کو صرف ایک لفظ یا جملے میں ''سیماب صفت'' سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

س) کیا آپ نے پہلے شاعری سے اپنے ادبی سفر کا آغاز کیا تھا؟

ج) جی شاعری بھی کی تھی لیکن سنجیدگی سے نہیں۔ پسندیدہ صفن سخن فکشن نگاری ہی ہے۔

س) آپ کا اولین افسانہ کس ادبی رسالے میں کہاں اور کب شائع ہوا تھا؟

ج) پہلے مقامی اخبار ورسائل میں، پھر کالج میگزین میں، پھر شاعر میں اور پھر نگینہ میں

س) کیا آپ نے اپنے افسانوں پر پروفیسر حامدی کاشمیری سے اصلاح بھی لی ہے؟

ج) پروفیسر حامدی صاحب ایک مخلص اُستاد اور مشفق بزرگ کی طرح اپنے گراں قدر مشوروں اور رائے سے آج تک نوازتے رہتے ہیں۔ باقاعدہ اصلاح نہیں لی۔

س) حامدی صاحب نے اپنے ادبی سفر کا آغاز تنقید نگاری سے کیا تھا، پھر وہ افسانے اور ناول بھی لکھنے لگے تھے۔ لیکن قبلہ اعجاز صدیقی کے مشورے سے اپنے استاد شہ زور کاشمیری کی طرح شاعری کرنے لگے تھے اور ان کا شعری سفر آج بھی جاری ہے۔

ج) حامدی صاحب کی شخصیت کے لاتعداد پہلو ہیں۔ تنقید نگاری، افسانہ، ناول اور شاعری ان کے موضوعات ہیں۔

س) ہندوستان کے اردو تخلیق کار عموماً مستعار ادبی تھیوریز سے وابستہ ہو کر کبھی روس تو کبھی امریکہ تو کبھی اسرائیل کے بھونپو بن جاتے ہیں اور مشرق بالخصوص ہندوستان کی صدیون پرانی تہذیب کو بھول گئے تھے۔ لیکن اب جو معاصر اردو افسانے مشرق اور ہندوستان کی گھروپسی ہوئی۔ کیا خیال ہے آپ کا۔

ج) میرے خیال میں ایسا نہیں ہے۔ ہر افسانہ نگار اپنے معاشرے اور تمدن کی عکاسی کرتا ہے۔ پریم چند سے لے کر موجودہ دور کے نامور اُردو افسانہ نگاروں تک۔ ادب پاروں میں زیادہ تر مقامی معاملات ہی کی عکاسی ملتی ہے۔ منٹو نے ابتداء میں مالی ضرورت کے پیش نظر فرانسیسی افسانوں کے ترجمے کئے، لیکن جن افسانوں نے اُسے شہرت و دوام بخشا وہ مستعار ادبی تھیوریز پر مبنی نہیں تھے۔

س) ترقی پسند افسانہ خواص وعام پسند رہا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ قارئین کا ایک بڑا طبقہ ادبی رسائل خرید کر پڑھتا تھا۔ افسانوں کے مجموعوں اور ناولوں کی فوخت ہوتی تھی، لیکن جدیدیت پسند مبلغین نے پہلے تو قاری کو موت کا اعلان کر دیا پھر لایعنی افسانے اور بے تکی شاعری نے اردو قارئین کو ادبیکتب ورسائل سے دور کرنا شروع کر دیا تھا۔ کیا فرماتے ہیں کہانی پنڈت اس باب میں؟

ج) جدیدیت نے واوی اردو قاری کی موت کا اعلان کر دیا تھا۔ جدیدیت کے زیر اثر جو فکشن منظر عام پر آیا، تجریدیت اور لایعنیت ، ابہام، نا قابل فہم علامتی اظہار وغیرہ سب قاری کی موت کا باعث بن گئے اور یہ سب ترقی پسند تحریک کے زیر اثر تخلیق ہونے والے افسانوں میں نہ تھا۔ لیکن یہ بات باعث اطمینان ہے کہ آج کا اُردو افسانہ دوبارہ قارئین اوردو فکشن کے لئے دلچسپ کا باعث بنتا جارہا ہے کہ اس میں جدیدیت سے قبل والی خوبیاں ھرلوٹ کر آرہی ہیں۔

س) ہر فن کار کا تخلیقی سفر ماہ وسال کے ساتھ تبدیل ہوتا رہتا ہے اور ماہ وسال کے آخری پڑاؤ پر یا تو فن کار خود کو دہرانے لگتا ہے یا تھک کر خاموشی کی سیاحت میں گم ہو جاتا ہے۔ کیا خیال ہے کشمیر کے مشہور صنعت کار کہانی نویس کا؟

ج) نئے لکھنے والوں کے پاس تازگی وتوانائی اور نیا فکر واحساس ضرور ہوتا ہے اور پرانے لکھنے والوں میں وسیع وعریض مطالعہ، مشاہدہ اور تجربہ ہوتا ہے، اور ذخیرہ الفاظ اور زبان واسلوب بھی۔ یہ بات بھی ہے کہ اردو کے سینئر افسانہ نگار ذرا سے کرداروں اور واقعات وپلاٹ کی تبدیلی اور ہیر پھیر سے اپنے آپ کو دہراتے رہتے ہیں۔ غالباً نئے نئے موضوعات ومسائل تک ان کی رسائی نہ ہونے کی وجہ سے لیکن سب بزرگ فکشن نگاروں کے بارے میں ایسا نہیں کہا جاسکتا۔ وہ ساٹھ ستر سالوں سے اردو افسانے کے کاکل سجانے سنوارنے کے باوجود بھی تازہ دم اور جوان نظر آتے ہیں۔

س) آپ کی کہانی کے موضوعات کیا ہوتے ہیں؟

ج) موضوعات مختلف النوع ہوسکتے ہیں، جو چیز کہانی لکھنے پر متاثر کرتی ہے، قلم اُٹھاتا ہوں، موضوع کی کوئی قید نہیں۔

س) کیا آپ ایک ہی نشست میں کہانی مکمل کر لیتے ہیں اور کسی دوسری نگاہ کے بغیر پھر

کتاب بند کر دیتے ہیں۔

ج) جی نہیں کہانی کئی نشستوں میں مکمل کر لیتا ہوں اور اگر ایک ہی نشست میں مکمل بھی کرلوں، غور وفکر کی کانٹ چھانٹ جاری رہتی ہے۔

س) آپ غیر معمولی تاخیر کے ساتھ کہانی دھرتی پر آباد ہوئے ہیں، کیا وجہ ہے؟

ج) شاید اس میں میری دیگر مصروفیات کا عمل دخل رہا ہو۔ لیکن میرے اندر کا کہانی کار ہمیشہ میرے ساتھ ساتھ رہتا تھا اور ہے بھی۔

س) اردو رسائل کی طرف بھی آپ نے تاخیر سے توجہ کی ہے، وجہ؟

ج) بیچ میں مصروفیات کی وجہ سے بیس تیس سال تک اردو رسائل و جرائد کے ساتھ میرا رابطہ منقطع رہا۔ لیکن پچھلے کچھ برسوں سے اس کمی کو پورا کیاہ۔

س) کسی معیاری اور زندہ کہانی کی بنت کے لئے آپ کس طرح کی تیاری کرتے ہیں؟

ج) تیاری کر کے میں نے کبھی لکھا نہیں۔ ذہن میں کوئی خیال وارد ہو کر اسے بے صبری کے ساتھ دامن قرطاس تک پہنچانے کی کوشش میں لگ جاتا ہوں۔ پھر کئی روز یا کئی ہفتوں تک غور و فکر اور ترمیم و تنسیخ کی مشق جاری رہتی ہے۔

س) کسی بولتی ہوئی کہانی کے اوصاف کیا ہیں؟

ج) پلاٹ اچھا ہو، بیانیہ متاثر کن ہو، کوئی نئی بات ہو، گھسا پٹا موضوع نہ ہو، عوام کی دُکھتی رگ پر انگلی رکھ دی گئی ہو، وغیرہ۔

س) آپ کی مادری زبان کون سی ہے؟

ج) مادری زبان کشمیری ہے۔

س) صوبہ کشمیر نہ صرف ہندوستان بلکہ کل عالم کے لئے ہمیشہ پسندیدہ صوبہ رہا ہے۔ آپ کو

بھی اپنے اس صوبے سے عشق ہوگا۔ کیا واقعی اور عشق کی وجوہ کیا ہیں؟

ج) ہر شخص کو مادرِ وطن سے محبت ہوتی ہے۔ کشمیر کا حسن، لوگوں کے اوصاف حمیدہ، فطرت پسندی، بھائی چارہ، سادگی اور صاف باطن وغیرہ۔

س) آپ کے افسانوں میں تخلیقی طنز کی وجہ کیا ہے؟

ج) حد سے زیادہ حساسیت۔

س) کہانی تحریر کرنے سے قبل آپ کے سوچ کینوس پر کس طرح کے رنگ لہریے بنتے ہیں؟

ج) کہانی کا مکمل خاکہ میرے ذہن میں نہیں ہوتا اور نہ کرداروں کے نام وغیرہ ہی۔ رفتہ رفتہ کہانی آگے بڑھتی ہے اور کردار و واقعات کے سانچوں میں ڈھلنے لگتی ہے۔

س) کیا آپ جو کچھ سوچ لیتے ہیں اُسے من وعن کاغذ بند بھی کر لیتے ہیں؟

ج) جی جو سوچ لیتا ہوں کاغذ بند کر لیتا ہوں۔ مکمل ہو جانے تک ترمیم و تنسیخ کا عمل بھی جاری رہتا ہے۔

س) معاصر اردو افسانہ کیا کامیاب کہانی بن رہا ہے؟

ج) معاصر اُردو افسانہ دوبارہ قارئین کی دلچسپی کا باعث بنتا جا رہا ہے۔ میں زیادہ تر علامتی پیرائے میں کہانی لکھتا ہوں، جو مجھے پسند بھی ہے۔

س) کیا آپ نے کشمیری زبان میں بھی کہانیاں تخلیق کی ہیں؟ کیا وہ کہانیاں شائع ہوئی ہیں؟

ج) جی نہیں، میں نے کشمیری زبان میں نہیں لکھا ہے۔ کشمیری میری مادری زبان تو ہے لیکن میں نے اس کو ذریعہ اظہار نہیں بنایا۔

س) آپ کی تخلیقی بابت کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ ماضی کے غزل کے شعراء کی طرح آپ

اپنے لکھے کو بار بار پڑھتے ہیں اور حذف واضافے بھی کرتے رہتے ہیں۔اس طرح کئی کہانیاں، ناولٹ اور پھر ناول بھی بن گئے تھے۔ نئے قلم کاروں کے لئے آپ کا یہ تدریجی رویہ تو مثال بھر ہوگا۔اجمال بھر اس کے بارے میں بتلائیے۔

ج) ردوقبول کا جذبہ انسان کی فطرت میں ہے۔میرے خیال میں ہر دس سال بلکہ اس سے بھی کم وقفے کے بعد تخلیق شدہ ادبی سرمائے پر نظر ثانی درکار ہوتی ہے۔ظاہر بات ہے یہ کوئی الہامی کتابوں والا معاملہ تو ہے نہیں کہ رد وقبول یا ترمیم وتنسیخ کفر ہے۔ Updation کرنے کے بہت سارے اجمالی پہلو ہیں۔

س) آپ کی بے چین تخلیق سوچ نے کہانی یا ناول جو لکھ دیا ہے کیا آپ اُس سے مطمئن ہیں؟

ج) اپنے مقدور بھر کام سے کوئی مطمئن نہیں ہوتا، جو کچھ کرنا چاہتا ہوں، نہیں کر پاتا ہوں، کوشش جاری ہے۔

س) ان دنوں کتابوں کے آخر میں رنگین سرورق میں خود مصنف وحشی سعید کے دو روپ دکھائے گئے ہیں، گویا کہ وحشی سعید اپنی آپ بیتی کتاب بند کر رہے ہیں، کیا خیال ہے ماضی اور حال والے وحشی سعید کا؟

ج) یہ زندگی کی اصل حقیقت ہے، جسے خاموشی کے ساتھ قبول کرنے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں ہے۔وحشی سعید اپنی آپ بیتی کتاب بند نہیں، یاد کر رہے ہیں۔

س) ستمبر 2012ء میں 20 کہانیوں پر محیط مجموعہ ''کنوارے الفاظ کا جزیرہ'' شائع ہوتا تھا۔ اس عنوان کے مجموعے کی آخری کہانی بھی ہے۔کنوارے الفاظ کا جزیرہ سے آپ کی مراد کیا ہے؟

ج) جس طرح لاتعداد اشعار ان کہے ہی رہ جاتے ہیں اُسی طرح لاتعداد افسانے بھی افسانے ہی رہ جاتے ہیں۔دامن قرطاس تک پہنچے سے قاصر اور محروم، لاتعداد کام

ادھورے رہ جاتے ہیں اور بے شمار خواہشیں اور خواب خواب ہی رہ جاتے ہیں۔ خوبصورت، دل کو لبھانے والے اور باعث تسکین وانبساط خواب جن کا تصور تک بہت خوبصورت اور مسحور کن ہوتا ہے، بھلے ہی وہ تکمیل تک نہ بھی پہنچ جائیں، لیکن یہی کیا کم ہے کہ ان خوبصورت خوابوں کی چکا چوند کرنے والی روشنی وتوانائی انسان کو ہر حال می پرعزم اور متحرک رکھتی ہے۔ کنوارے الفاظ کا جزیرہ میرے خواب ہیں۔ خوبصورت اور سنہرے خواب جو مجھے ہر دم تندرست اور توانا رکھتے ہیں۔

س) کنوارے الفاظ کو اگر افسانچہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ کیا آپ نے افسانچے بھی تخلیق کئے ہیں؟

ج) مختصر افسانے یا افسانچے تخلیق کئے ہیں۔ پھر وہی بات دہراؤں گا۔ یہ پلاٹ کے تقاضے پر منحصر ہے۔

س) منٹو کے ''سیاہ حاشیے'' افسانچوں کا اولین مجموعہ ہے۔ منٹو کشمیری بھی ہے۔ کیا خیال ہے کشمیری ہم مزاجوں کا؟

ج) جی ''سیاہ حاشیے'' عوام وخواص مین مقبول نہیں ہوا۔ شاید اس کی ایک وجہ منٹو کو اپنی ڈگر تبدیل کروانے کی باعث بن گئی۔ اس کے بعد منٹو کے جو افسانے آئے وہ بالکل مختلف اور الگ نوعیت کے ہیں جنہوں نے منٹو کو بام عروج تک پہنچا دیا۔ منٹو بھی کشمیری تھے اور میں بھی کشمیری ہوں۔ لیکن اپنے افسانوی سفر کے آغاز میں میرا مزاج ایسا تھا، آج بالکل اس سے مختلف اور الگ ہے۔

س) منٹو رنگ افسانچوں کو رسالہ شاعر نے ایک ادبی تحریک بنا دیا تھا، اور خصوصی شمارے گوشۂ رونق جمال اور گوشۂ ایم اے حق میں بہت سارے افسانچے شائع کئے تھے۔ کیا آپ نے مذکورہ دونوں شمارے ملاحظہ کئے تھے؟

ج) دونوں شمارے میری نظر سے گزرے تھے اور واقعی دستاویز کی حیثیت رکھتے ہیں۔

س) آپ کا ادبی رسالہ ماہنامہ شاعر اردو کا واحد عالمی ادبی جریدہ ہے جس کی اس تحریک سے پاکستان اور اردو کی نئی بستیوں کے مشاہیر افسانہ نگار بھی متحرک ہوئے تھے اور افسانچے کی جدید تکنیک سے انہیں نثری نظموں سے علیحدہ کر کے افسانے بنایا تھا کہ اس طرح کے ہر افسانچہ کسی مکمل کہانی سے کم نہیں معلوم ہوتا تھا۔ آپ کے خیال میں شاعر کے اس ادبی اختراع کا کوئی مستقبل ہے کہ نہیں؟

ج) اس نوعیت کے افسانے اب ایک عرصہ سے لکھے جا رہے ہیں اور قارئین اردو افسانہ انہیں پسند بھی کرتے ہیں۔ اردو کے معروف افسانہ نگار بھی اس میں طبع آزمائی کرنے لگے ہیں۔ شاعر کا یہ اقدام جرأت مندانہ تھا جسے اردو داں طبقے نے پسند بھی کیا۔

س) آپ چونکہ افسانے سے ناولٹ اور ناول تخلیق کر دینے کے فن سے بخوبی واقف ہیں، لہٰذا آپ کے افسانچے بھی ایک نئے معیار کی تحریک و ترغیب دیں گے۔ کیا فرمائیں گے اس باب میں کنوارے الفاظ کے متلاشی گبرو کشمیری۔

ج) افتخار احمد صدیقی صاحب جیسے مدیر اگر مجھ سے اس قسم کی توقعات رکھتے ہیں تو میں اسے اپنی خوش بختی سمجھتا ہوں۔

س) ہر صنف کی اپنی ایک ہیئت ہوتی ہے، جیسے کہ غزل، آزاد نظم، نثری نظم، آزاد غزل (اسے غزل نما بھی کہا جا رہا ہے) یہ ایک طویل ادبی بحث ہے، پھر بھی خاکسار نے منٹو کے سیاہ حاشیے سے اس کی تخلیقی ساخت کا تعین کیا تھا۔ منٹو نے ایک سطری افسانچے بھی لکھے اور تین سطری بھی۔ ایک پیراگراف کو محیط افسانچے ایک صنفی افسانچے۔ اگر افسانچے کو الف، ن، س، ا، ن، چ اور ہائے ہنوز کے طور پر لکھا جائے تو یہ سات لفظوں کا مجموعہ ہے۔ افسانچہ ان ہی حدود میں مکمل دیکھتا ہے۔ ایک زائد لفظ یا مختصر سطر۔ اس

ضمن میں عبدالعزیز خان نے ایک سطری افسانچے شاعر کے لئے لکھے تھے۔ راقم نے ایک ایک لفظ سے افسانچے کا تصور بھی دیا ہے۔ مثلاً یہ کہ اگر آج صرف عشق سے بے شمار یک سطری افسانچے، کہانیاں، ناولٹ، ناول اور داستانیں تخلیق کی جاسکتی ہیں۔ کیا خیال ہے کنوارے الفاظ کے کشمیری نوخیز عاشق وحشی سعید کا۔

ج) اس طرح کے تجربے اس سے قبل بھی ہو چکے ہیں اور یہاں تک بھی کہا گیا کہ لفظ ''کنواں'' بھی اپنے اندر ایک مکمل افسانہ یا افسانچہ ہے، لیکن بدقسمتی سے اس طرح کے تجربے نہ مقبول ہوئے اور نہ کامیاب، فکشن نگاری میں بھی نہیں شاعری میں بھی نہیں۔ بقول آپ کے ہی کہ ہر صنف کی ایک ہیئت ہوتی ہے۔

س) حساس اور زود گو فنکار کے لئے کوئی ایک لفظ ہی کافی ہوتا ہے جو اپنے سوچ کینوس پر اس کو سورنگ سے مصور کرنے کی تخلیقی کاوش کرتا ہے۔ یہ صورت گری نظم کی جملہ اصناف کے ساتھ بھی لاگو ہوں گے۔ آپ اردو داں ہیں اور اردو ہی میں اپنے سوچ سمندر کو سونامی رنگ کرتے ہیں۔ لیکن کشمیر ایسے صوبے کی نمائندگی بھی کرتے ہیں۔ کیا آپ نے کشمیری الفاظ بھی اپنے فن کی سان پر رکھے ہیں۔

ج) ابھی تک تو نہیں۔ اقبال، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، یہاں تک کہ منٹو کی مادری زبان بھی اردو نہ تھی۔

س) ناول ''پتھر پتھر آئینہ'' کا تخلیقی ظہور کس طرح ہوا۔ اس ناول کو آپ نے ۱۱۶ اقساط میں بیان کیا ہے۔ عام طور پر ناولوں میں ایسی ترتیب نہیں رکھی جاتی، بلکہ انہیں ابواب میں تقسیم کر دیا جاتا ہے۔ بعض ناول نگار ہر باب کو اسی بات کی کہانی کو کسی عنوان سے بیان کرتے ہیں۔ آپ کے سوچ کینوس پر اس ناول کی تخلیق کا کاکیا خاکہ تھا؟

ج) ''پتھر پتھر آئینہ'' کی تخلیق سے قبل میرے ذہن میں اس ناول کے متعلق کوئی باقاعدہ

خاکہ یا منصوبہ نہ تھا۔ ناول لکھنے کی غرض سے جب قلم اُٹھایا تو قلم چلتا رہا اور ناول کی اقساط تخلیق ہوتی رہیں اور جہاں قلم رُک گیا وہاں اختتام۔ میرے خیال میں ناول کو ابواب میں تقسیم کرنا یا اقساط میں ایک ہی بات ہے۔

س) جس طرح ڈارمہ نگار اپنے ڈراموں میں تجسس وغیرہ کے تخلیقی رنگ بھر کر قاری کو باندھ دیتا ہے، جیسے شیکسپئر، آغا حشر کاشمیری، اردو میں ابراہیم یوسف، امتیاز علی تاج، مجیب خان وغیرہ۔ آپ نے بھی اپنے ناول ''پتھر پتھر آئینہ'' میں آخری صفحہ ۱۴۰ پر لکھا ہے: اور پھر موسم خط۔ یک لخت غائب ہوگیا۔ اس طرح قاری کو ناول کی ابتداء کا اولین پیراگراف: زور کی آندھی چلی، آندھی اپنے ساتھ زوروں کی بارش لائی۔ صفحہ ۵۰۔ کیا آندھی کی طرح اپنے قارئین کو تجسس وغیرہ کی تخلیقی سیاحت کرواتے ہیں۔

ج) قاری کو اپنے ساتھ مضبوطی کے ساتھ باندھ کے رکھنے کی کوشش میں کامیاب اشخاص ہی اچھے فکشن نگار کہلائے جاتے ہیں۔ ہر ایک مصنف کی اولین کوشش بھی یہی رہتی ہے اور جو اس مقصد میں جتنا کامیاب ہوتا ہے وہ اُتنا ہی کامیاب افسانہ نگار، ناول نویس یا ڈرامہ نگار کہلاتا ہے۔

س) کیا آپ نے کبھی ڈرامے بھی لکھے؟

ج) ڈرامے لکھنے کی سنجیدہ کوشش ابھی تک نہیں کی ہے۔

س) کیا تخلیقی بیانیہ بے جان اور سپاٹ ہوگیا ہے؟

ج) تخلیقی بیانیہ کی بے جانی کی شکایت جدیدیت کے زیر اثر تخلیق ہونے والے ادب کے بارے میں تھی، میرے خیال میں آج ایسا نہیں ہے۔

س) آپ تخلیقی بیانیہ کے پارکھی ہیں۔ اس کے لئے آپ کن امور پر خصوصی توجہ دیتے ہیں؟

ج) اس میں لایعنیت یا تجریدیت والے عوامل و کیفیات نہ ہوں، متاثر کرتا ہو۔ الفاظ

وتراکیب کا ٹھیک استعمال ہوا ہو۔ زبان و بیان اور انداز و اسلوب نا قابل فہم نہ ہو اور علامات بھی۔

س) نثری نظم اور تخلیقی بیانیہ میں کیا فرق ہے؟

ج) وہی ہیئت وتکنیک کا تخلیقی بیانیہ ہر صنف سخن کا لازمی جز ہے۔ البتہ اس کی ہیئت وتکنیک الگ الگ اصناف سخن میں الگ الگ اور جداگانہ ہے۔

س) انگریزی میں فکشن کے تحت کہانی، ناولٹ، ناول، داستان سبھی کچھ بن جاتے ہیں۔ اردو میں لیکن کوئی ایک لفظ مکمل نہیں بن سکا جس میں مذکورہ نثر کی تینوں اصناف سما جائیں۔ کیا خیال ہے کشمیری صوفی وحشی سعید کا؟

ج) میرے خیال میں اردو کہانی، ناولٹ، ناول، داستان، ڈراما سب فکشن نگاری میں ہی آتے ہیں۔

س) کیا آپ پہلے کسی واقعے کو سوچتے اور پھر مختلف النوع کرداروں میں تقسیم کر دیتے ہیں، یا کوئی اور طریقہ کار ہے آپ کا؟

ج) جی نہیں، میں لکھنا شروع کر دیتا ہوں۔ پلاٹ، کردار اور منظر نامے سے روشناس اور متعارف ہوتا رہتا ہوں۔

س) آپ نے اپنے طالب علمی دور میں جو افسانے لکھے تھے اُنہیں بھی ماضی اور حال میں سما دیا۔ تو کیا آپ نے انہیں من وعن کتاب بند کر دیا ہے یا اُنہیں حذف واضافے کے بعد مجموعے میں شامل کیا۔

ج) جی نہیں، من وعن ہی کتاب میں شامل کر دیا ہے۔ کوئی ترمیم وتنسیخ نہیں کی ہے، بلکہ کبھی کبھی اپنی کوئی بہت پرانی تخلیق پڑھ کر حیرت بھی ہوتی ہے کہ کیا واقعی میں اس طرح کی کہانیاں بھی لکھ چکا ہوں۔

س) ماضی اور حال (۲) میں قصہ دراصل یہ ہے کہ تحت جو دس افسانوں کو شامل کیا گیا ہے، وہ الگ الگ وقوع ہیں، جنہیں علیحدہ علیحدہ عنوانات سے بھی لکھا جا سکتا ہے۔ ایسا کیوں ہوا؟

ج) نئے نئے تجربے کرنے کا میرا شوق یا جنون۔ اسے قارئین کی ایک اچھی خاصی تعداد نے پسند بھی کیا۔

س) اردو میں سب سے زیادہ پڑھا جانے والا افسانہ نگار آپ کی نگاہ میں کون ہے اور کیوں ہے؟

ج) میرے خیال میں منٹو، کہ اس کے مجموعوں کے لاتعداد ایڈیشن چھپ چکے ہیں اور چھپ بھی رہے ہیں۔ شاید اس لئے کہ منٹو اُردو کا وہ پہلا افسانہ نگار ہے جس نے پردے کے پیچھے کی سچائیوں کو منظر عام پر لایا۔

س) منٹو کو فحش افسانہ نگار کہا جاتا ہے۔ اس کی بعض کہانیوں پر لاہور کی عدالت میں مقدمے بھی چلائے گئے۔ لیکن وہ عدالت سے بری بھی کر دیئے گئے۔ منٹو رنگ کہانیوں میں کھول دو، ٹھنڈا گوشت، دھواں، کالی شلوار جیسی کہانیوں کو فحش کہا گیا۔ کیا واقعی مذکورہ افسانے فحش ہیں؟

ج) واقعی منٹو فحش نگار ہے۔ لیکن جن حقائق و واقعات سے منٹو نے پردہ اُٹھایا اگر ان کو حقیقی زندگی میں انجام دینے والے بے شرم، بے حیا اور بے غیرت نہیں تو انہیں صدق دلی اور ایمانداری سے ضبط تحریر میں لانے والا منٹو فحش نگار کیوں کر ٹھہرا؟

س) کیا آپ نے بھی منٹو رنگ افسانہ لکھا ہے، جب کہ آپ کے یہاں نارنگی کا کردار بھی ہے، جس کے ساتھ آپ بچپن میں ایک ندی میں بے لباس پیرا کی بھی کی ہے۔ کیا واقعی نارنگی آپ کے بچپن کی ساتھی تھی جو بعد میں آپ کے سوچ کینوس پر آپ کی

معشوقہ بھی بنی اور کہانی رنگ بھی ہوئی، تو کیا یہ صحیح ہے؟

ج) اس سے قبل بھی عرض کر چکا ہوں کہ ابتدائی دور میں اس طرح کے افسانے تخلیق ہوئے تھے۔ کہانیوں کے کردار و واقعات فرضی ہوتے ہیں۔ ان میں سچائی تلاش کرنا چہ معنی دارد۔

س) کیا آپ عشق پر یقین رکھتے ہیں؟ کسی گوشت پوست کے گزار بدن کے سحر میں آپ بھی گرفتار ہوئے ہیں۔ بلا مبالغہ بیان کیجئے۔

ج) اس طرح کے سوالات کا جواب ستر سال کی عمر کو پہنچے یا پہنچنے والے اشخاص سے بلا مبالغہ بیان نہیں ہوگا۔

س) ہر تخلیق کار کے فن کار کا محرک ضرور ہوتا ہے جیسا کہ ماضی کے اساتذہ نے اپنی غزلوں میں اپنے معشوق کی کبھی وصل کبھی ہجر کے باب میں شعری کا اظہار کیا ہے۔ آپ کے افسانہ کہانیوں کا محرک کیا ہے؟

ج) ضروری نہیں کہ ہر شاعر مرزا اسداللہ خان غالب کی طرح کسی ڈومنی پر فریفتہ ہو، اور اس کے ہجر و وصال کے پس منظر میں شاعری کر رہا ہو۔ بقول انتظار حسین، گلاب کے پھول کے گل قند بنانے کے علاوہ بھی کئی مصرف ہو سکتے ہیں۔ نور شاہ جیسے رومانیت کے پروردہ افسانہ نگار کے لئے اس قسم کا محرک ہوسکتا ہے۔ میرے جیسے کہانی کار کے لئے ۔ ۔ ۔ اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا۔

س) ''قصہ دراصل یہ ہے'' سیریز ناول بھی بن سکتا ہے کہ نہیں۔

ج) ہر چیز بن سکتی ہے اگر آپ بنانے کے موڑ میں ہوں تو اور خدا کے سوا کوئی مچھر جیسی شے بھی نہیں بنا سکتا۔

س) آپ کے سوچ کینوس پر کہانیاں اُبھرتی اور لکھی جاتی ہوں گی تو آپ انہیں کس طرح

کاغذ بند کرتے ہیں؟

ج) وہ دن بھی کیا تھے جب کئی کئی کہانیاں ایک ہی نشست میں مکمل کرلیا کرتے تھے۔آج ایک کہانی کئی دن کئی ہفتے کئی مہینے بھی لیتی ہے۔

س) آپ تخلیقی مواد کا خیال رکھنے کے لئے کیا کیا جتن کرتے ہیں؟

ج) اس مرحلے پر مطالعہ اور مشاہدہ بہت کام آتا ہے اور رہنمائی کرتا ہے۔

س) ہر تخلیق کار کا اپنے لکھنے کا الگ الگ ڈھنگ ہوتا ہے۔مثلاً بعض قلم کار اوندھے منہ لیٹ کر لکھتے ہیں۔بعض اکڑو بیٹھ کو تو بعض کھڑے ہو کر لکھتے ہیں۔آپ کا طریقہ اظہار کیا ہے؟

ج) اکثر آفس میں یا پھر گھر میں اپنے کمرے میں خلوت نشین ہو کر لکھتا ہوں۔

س) آپ کس طرح کا کاغذ، قلم اور روشنائی پسند کرتے ہیں؟

ج) عام کاغذ اور عام قلم اور روشنائی کوئی خاص پسند نہیں ہے۔

س) آپ جب کوئی کہانی مکمل کر لیتے ہیں تو پھر اس کے بعد کا عمل کیا ہوتا ہے؟

ج) کہانی مکمل کر کے کئی بار پڑھ لینے کے بعد ٹھیک ٹھاک کر کے کمپوزنگ کے لئے دیتا ہوں اور دوستوں کو سناتا ہوں۔

س) آپ کے تخلیق کردہ افسانوں کا اولین سامع کون ہوتا ہے۔کون سن افسانوں کا قاری بنتا ہے؟ جیسا کہ سارا اُردو جہاں جانتا ہے کہ ماہنامہ شاعر ۸۷ سالہ رسالہ ہے۔رُباعی پر دو شمارے، افسانچوں پر دو شمارے، ری میک پر ایک شمارہ، ری میک کہانیوں کی اشاعت شاعر ہی کے ذریعہ سے ہوئی ہے۔کیا آپ نے بھی کوئی ری میک کہانی لکھی ہے اس تجربے کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

ج) اکثر اراکین نگینہ نور شاہ، مظفر ایرج اور ڈاکٹر اشرف آثاری۔معیاری رسائل میں چھپنے

کے بعد اکثر قارئین اردو افسانہ۔

س) ہم نے سریندر پرکاش اور سلام بن رزاق، عبدالعزیز خان کی ''بجوکا'' کا استعارہ بنا کر ری میک کہانیاں لکھوائی تھیں اور شاعر کے ایک شمارے کو ان کے لئے مختص کر دیا تھا۔ دراصل آج کا کشمیر اور مکمل ہندوستان جن سیاست دانوں کے رحم وکرم پر ہے اُن کے لئے آج کا بجوکا کی سخت ضرورت ہے۔ یہ بجوکا انا ہزارے بھی ہوسکتا ہے اور کیجریوال بھی ہوسکتا ہے۔

ج) جی بالکل ہوسکے ہیں۔ ہر دور میں کسی بجوکا کی ضرورت شدت سے محسوس ہوتی ہے۔ خاص کر آج کی گندی سیاست کے تناظر میں۔

س) اب چند ایک ذاتی نوعیت کے سوالوں کے بے باکانہ جواب دیجئے۔ آپ ایک کشمیری ہیں اور ہندوستان پسند صوبے کے اہم صنعت کار بھی ہیں۔ حساس قلم کار لکھار بھی ہیں۔ اس وقت ملک جس عدم رواداری کی راہ پر گامزن ہے اور ہر طرح سے ہندوستان کی دوسری بڑی اکثریت کو کبھی جہاد، تو کبھی گھر واپسی، تو کبھی بیف کے ذریعے تنگ کیا جارہا ہے اور یہ سب کچھ مرکزی سرکار کے ذریعے ناگپور کے زہریلے ناگ کر رہے ہیں۔ کیا خیال ہے کشمیر سوچ کے آزاد پسند قلم کار کا؟

ج) کشمیر میں چل رہے انتہائی ابتر اور سفاکانہ حالات اور کشمیریوں کا ردعمل اس سوال کا جواب ہے۔

س) کشمیری کھانوں میں وازوان کا اپنا الگ کشمیری ذائقہ ہے۔ اس مخصوص کھانے کا رواج ملک اور ملک باہر نہیں ہوسکا۔

ج) دنیا بھر میں گھوما ہوں۔ ''وازوان'' اور کہیں نہیں ملا۔ پتہ نہیں ہمارے اسلاف نے یہ کھانے کہاں سے سیکھے تھے کہ دستر خوان پر اکٹھے تناول کرنے والے دشمن بھی دوست بن جاتے ہیں۔

س) آپ کی مرغوب غذائیں، پھل اور مشروب کون سے ہیں؟

ج) کشمیری کھانے، سیب، سنگترے، انگور یہ سب۔ حالانکہ ان دنوں پرہیز سے ہوں۔

س) آپ کس طرح کی پوشاک پسند کرتے ہیں؟

ج) دفتر میں کوٹ پتلون اور گھر میں قمیض پاجامہ وغیرہ۔

س) آپ کے پسندیدہ موسم، رنگ، خوشبوئیں، مقامات کون سے ہیں؟

ج) کشمیر کے چار موسموں میں اپنا ایک حسن اور خوبصورتی ودلکشی ہے۔ سردی کے ایام میں اکثر دہلی چلا جاتا ہوں۔

س) کیا آپ ہندوستان میں اُردو کے مستقبل سے مطمئن ہیں؟

ج) اردو کی مٹھاس اور شیرینی اسے اس کے دشمنوں کے بھی سر آنکھوں پر بٹھا سکتی ہے۔ البتہ سیاست دان اس کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔

س) اردو واحد زبان ہے جو پورے ملک میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ لیکن اسے ہندی کا نام دیا جاتا ہے جب کہ ہندی فلموں کی روح اردو زبان ہی ہے۔ کیا فرماتے ہیں کشمیری سوچ وحشی سعید؟

ج) یہاں بھی وہی گندی سیاست کارفرما دکھائی دیتی ہے۔

س) اس ملک میں اقلیتوں کا تحفظ کس طرح ممکن ہے کہ آج دلتوں کو بھی نشانہ بنایا جارہا ہے۔ کیا سوچتے ہیں قلم شور وحشی سعید۔

ج) وہ دن دور نہیں کہ جب مسلمان، دلت، سکھ اور دیگر اقلیتیں ایک ہو جائیں گی۔

س) آپ نے اپنے ماہ وسال میں جتنا کچھ دین ودنیا کو جی لیا ہے، اُس سے مطمئن ہیں؟

ج) انسانی دماغ میں اطمینان نام کی کوئی چیز کہاں! بہت کچھ کرنا چاہتا ہوں۔ زندگی رہی تو انشاءاللہ کروں گا۔ ہاتھ پیر سمیٹ کر بیٹھنے سے کچھ کرنا بہت بہتر ہے۔

جمالیات کا شہنشاہ ۔ ۔ ۔ ڈاکٹر شکیل الرحمٰن صاحب

از ۔ ۔ وحشی سعید

1969ء میں کشمیر یونیورسٹی میں ایم اے اردو میں داخلہ لیا تھا۔ طالب علمی کے وہ سال جو یونیورسٹی میں گزرے، میری زندگی کا سب سے انمول حصہ ہیں۔ زہے قسمت کہ اردو اساتذہ میں کئی قد آور علمی اور ادبی شخصیات تھیں ۔ اس گراں قدر فہرست میں عالی مرتبت جناب عبدالقادر سروری صاحب تھے جن کے بارے میں مشہور تھا کہ خود تو انہوں نے پی ایچ ڈی نہیں کی تھی لیکن چالیس سے زائد اردو اسکالروں کی پی ایچ ڈی مکمل کرانے میں رہبری فرمائی تھی۔ اُن کی یہ صلاحیت ایک الگ خصوصیت کی حامل تھی جو میرے دل اور تخلیقی ذہن پر نقش ہوگئی تھی۔ عبدالقادر سروری صاحب صدر شعبہ بھی تھے۔ اُن کے نائب اور شعبہ اردو کے ڈین جناب ڈاکٹر شکیل الرحمٰن صاحب تھے۔ بہار کے رہنے والے ہمارے اس استاد کی زندگی کے بہترین تیس سال سرینگر کشمیر میں گزرے۔ جب وہ یہاں سے بہار واپس گئے تو پٹنہ یونیوسٹی کے وی۔ سی مقرر ہوئے۔ لیکن زندگی کے آخری ایام تک اُنہیں کشمیر سے دور ہونے کا صدمہ لاحق رہا۔ میرے تیسرے بہترین اُستاد جناب حامدی کاشمیری صاحب تھے جنہوں نے میری ایم اے کی طالب علمی کے دوران ہی اپنی ڈاکٹریٹ کی ڈگری مکمل کی۔ مجھے ان تینوں اساتذہ کی سرپرستی اور شفقت بالخصوص حاصل رہی ہے۔ عبدالقادر سروری صاحب نے اپنی کتاب ''کشمیر کی اُردو تاریخ'' میں دو صفحات پر میرا ذکر کیا ہے۔ حالانکہ اُس وقت میری عمر محض اکیس سال تھی۔ حامدی صاحب نے جب میرا افسانہ ''جمود کا جنازہ'' اُس وقت کے صفِ اول کے موقر جریدے ''شاعر، بمبئی'' میں چھپا دیکھا اور اُس کا مطالعہ

کیا تو بہت متاثر ہوئے اور ایم اے کے طالب علموں کو ایک پورا لیکچر اس افسانے کے تعلق سے دیا۔ لیکچر کے درمیان ہی انہوں نے یہ پیشن گوئی بھی کی کہ وحشی سعید ایک منفرد افسانہ نگار بن کر اُبھریں گے۔ اکثر و بیشتر وہ ادبی محفلوں میں اس بات کا ذکر بھی کیا کرتے تھے۔ چونکہ اس تحریر میں ہم محترم ڈاکٹر شکیل الرحمٰن صاحب کی محبت اور شفقت کا تذکرہ مقصود ہے، لہذا اُسی طرف آتا ہوں۔

ڈاکٹر شکیل الرحمٰن صاحب بڑی خوددار شخصیت کے مالک تھے، لیکن میرے نزدیک خودداری اور اہنکار کے درمیان ایک باریک سی لکیر ہے۔ شاید مرحوم کو بھی زندگی کے آخری ایام میں اس بات کا احساس ہو گیا تھا کہ انہوں نے جانے انجانے خودداری کی سرحد کو پار کر کے بعض اوقات اہنکار کے سرزمین پر بھی قدم رکھ دیا تھا۔ انہوں نے زندگی کے آخری ایام میں خود کو ایک نیا نام ''سائیں بابا'' بھی دیا تھا۔ دورانِ علالت اکثر و بیشتر وہ مجھ سے فون پر بات کرتے تھے۔ نہ جانے کیوں اُنہیں میری صلاحیت پر اس قدر یقین تھا کہ اپنی تمام کتابوں کے نسخے مجھے منگانے کا حکم دیا تا کہ میں اُن پر کچھ کام کروں۔ میرے دہلی آفس کا منیجر اُن کے گڑگاؤں والے مکان پر گیا اور وہ کتابیں لایا۔ اُن کی عطا کی ہوئی وہ کتابیں میری زندگی کا بہترین ادبی سرمایہ اور تحفہ ہیں۔ اس کے کچھ عرصے بعد ہی ڈاکٹر شکیل الرحمٰن صاحب خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ وہ طالب علمی کے دور سے ہی مجھ سے اس قدر شفقت رکھتے تھے کہ میری تربیت کے لئے مجھے ساتھ لے کر بہت سی ادبی مجالس اور مشاعروں کو منعقد کرایا۔ اُن کی سرپرستی میں شعبہ اردو میں بزم ادب کی بنیاد پڑی۔ میرے یونیورسٹی سے فارغ ہونے کے بعد وہ اکثر و بیشتر موجودہ طالب علموں کے ساتھ اُن مجالس کا ذکر کرتے رہتے تھے۔ اس سے کسی کو کب انکار ہو سکتا ہے کہ وہ اردو کے صف اول کے نقاد تھے۔ انہوں نے جمالیات کے موضوع کو جس تکنیکی انداز سے سمجھانے کی کوشش کی، اُس کی کوئی دوسری مثال اردو ادب میں نہیں ہے۔ اردو تنقید میں جمالیات پر لکھے گئے ڈاکٹر شکیل الرحمٰن صاحب کے مضامین بہت ہی عظیم ادبی سرمایہ ہیں۔ حالانکہ انہوں نے دوسرے موضوعات پر بھی بہت کام

کیا ہے لیکن جمالیات پر اُن کے تخلیقی کارناموں کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

میرے رسالہ ''نگینہ'' کو یہ فخر بھی حاصل ہے کہ انہوں نے جو افسانے لکھے اُن میں سے کچھ رسالہ نگینہ کے صفحات کی بھی زینت بنے۔ میری ادبی زندگی کے خدوخال سنوارنے میں اُن کا بہت اہم کردار ہے۔ درمیان میں کچھ عرصہ تک میں تخلیقی سطح پر ادبی دنیا سے دور رہا، اس لئے ہمارا ایک دوسرے سے رابطہ ٹوٹ گیا تھا۔ لیکن اُن کی زندگی کے آخری ایام میں وہ رابطہ پھر بحال ہو کر مزید اُستوار ہو گیا تھا۔ اللہ اُنہیں مغفرت نصیب فرمائے۔ آمین



نورشاہ اور میں

نورشاہ کے ساتھ میری پہلی جان پہچان ادبی رسالوں کے ذریعے اُس وقت ہوئی جب میں دسویں جماعت کا طالب علم تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ماہنامہ ''بیسویں صدی'' اردو زبان وادب پر ایسے چھائے ہوا تھا کہ اس کے ذکر کے بغیر اردو ادب کی تاریخ نامکمل تھی۔ اُسی زمانے میں بیسویں صدی میں نورشاہ کا طوطی بولتا تھا۔ ہم جیسے اردو کے نئے لکھنے والوں کے لئے نورشاہ کی مقبولیت باعثِ رشک تھی اور نئے لکھنے والوں کے لئے وہ کسی ہیرو سے کم نہ تھے۔ حالانکہ اُس زمانے میں بہت سارے ادباء، شعراء اور افسانہ نگار اپنے آپ کو ترقی پسند تحریک کے ساتھ منسلک ہونے پر فخر محسوس کرتے تھے لیکن میری سمجھ یہ کہتی ہے کہ ادب کو حصوں میں بانٹا نہیں جاسکتا۔

ایس پی کالج میں دورانِ تعلیم ہی رسالہ ''نگینہ'' کو سرکاری رجسٹریشن ملا۔ اُن دنوں نورشاہ کے برادر اصغر بشیر شاہ میرے بہت قریب آ گئے تھے اور رسالہ ''نگینہ'' میں اُن (بشیر شاہ) کے مضامین چھپنے لگے۔ بشیر شاہ ہر بار مجھے یہ کہتے کہ اُن کے مضمون کو پوری اہمیت کے ساتھ چھاپا جائے۔ وہ اگلی بار نورشاہ کی ایک نئی غیر مطبوعہ کہانی ''نگینہ'' کے لئے لائیں گے اور یہ ان کا ہر بار کا وعدہ ہوتا۔ اس بات کا ''نگینہ'' کے ایک پرانے شمارے میں ذکر بھی ہے۔ اُس دور میں بھی نورشاہ نگینہ میں چھپتے رہے۔

ایک وقت ایسا بھی گزرا جب ترقی پسند ادب بہت زیادہ بور کرنے لگا۔ اُس لمحے اردو ادب میں رومان پرور افسانے ایک نئے آب وتاب کے ساتھ منظر عام پر آنے لگے۔ اردو ادب کے لئے یہ تبدیلی نہ صرف خوشگوار تھی بلکہ افسانے اور بالخصوص رومان پسند افسانوں کے لئے ایک نعمتِ غیر

مترقبہ بن گئی۔ یہ افسانے بہت پسند کئے گئے۔ ایسے پس منظر میں نور شاہ ایک بڑا نام بن کر اُبھرے۔ یہ وہ دور تھا جب ابن صفی کے جاسوسی ناول عروج پر تھے۔ حالانکہ ہمارے بہت سارے ادباء کو یہ شکایت رہی کہ جاسوسی ناولیں ادب کا حصہ نہیں ہیں لیکن میرے نزدیک کوئی بھی کہانی ہو، کسی بھی قسم کی کہانی ہو، اگر کہانی کار اپنے فن میں کمال رکھتا ہو، اپنے انداز بیان اور پیش کش پر ید طولیٰ رکھتا ہو تو جاسوسی ناول بھی ادب کا حصہ بن سکتا ہے۔ نور شاہ رومانیت سے لبریز اپنے افسانوں میں نہ صرف باکمال کہانی کار بن کر اُبھرے ہیں بلکہ وہ ان میں رومانیت کی ایسی جادوگری ہیں کہ ہم اُس سحر سے باہر نہیں آپاتے اور جلد ہی اردو ادب کی افسانوی دنیا میں ان کی شخصیت ایک اُستاد بن کر اُبھر گئی۔ اُن کے فن کا یہ کمال ہے کہ وہ اپنے پڑھنے والے کو اپنی کہانی کی گرفت میں باندھے رکھتے ہیں۔

میں اپنے وطن کشمیر سے بہت عرصے تک دور رہا۔ زرمعاش کے لئے بدیشوں کی خاک چھانتا رہا۔ جب وطن آیا تو ایک روز اپنے ہوٹل کی ایک تقریب میں نور شاہ کو اپنے سامنے پایا۔ اُنہوں نے اپنی کتاب ''کشمیر کے اردو افسانہ نگار'' مجھے پیش کی۔ اس کتاب میں نور شاہ نے جس محبت سے کشمیر کے مایہ ناز افسانہ نگاروں کے ساتھ میرا بھی تذکرہ کیا ہے وہ میرے دل کو چھو گیا اور میرے لئے ایک نئی ادبی اُمنگ کا مژدہ ثابت ہوا۔ یہاں سے ہماری دوستی کی شروعات ہوئی۔ رسالہ ''نگینہ'' نئے سرے سے ادبی دنیا میں نمودار ہوا۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ اس میں نور شاہ کا بھی ایک اہم رول ہے۔ نور شاہ کی افسانہ نگاری کا میں ہمیشہ ایک مداح اور پرستار رہا ہوں لیکن میرے لئے اُن کی دوستی زیادہ اہم اور انمول ہے۔



ڈاکٹر اشرف آثاری میری نظر میں

2012ء میں اردو اکیڈیمی کی تقریب ہوٹل شہنشاہ میں کسی کتاب کی اجراء کے سلسلے میں منعقد ہوئی۔اس تقریب میں نورشاہ نے میرا تعارف ڈاکٹر اشرف آثاری سے کرایا۔ان کے ساتھ میری یہ ملاقات ایک عظیم سعادت ثابت ہوئی۔ میں نے رسالہ نگینہ کا ازسرنو اجرا کی سوچی۔ میری درخواست پر ڈاکٹر اشرف آثاری رسالہ نگینہ کے اراکین میں شامل ہوئے۔ حالانکہ ڈاکٹر اشرف آثاری عمر میں مجھ سے چھوٹے ہیں لیکن علمی ذہانت میں مجھ سے بہت آگے ہیں۔ڈاکٹر صاحب کی شخصیت میں کئی شخصیتیں پوشیدہ ہیں۔لیکن اُن کی ہر شخصیت علمی اور ادبی بصیرت سے مالا مال ہے۔تخلیقی وسعت کی غماز ہے۔وہ شاعر ہیں،افسانہ نگار ہیں، محقق اور ناقد بھی۔اُن کو صحافت میں بھی دلچسپی ہے۔ایک ڈاکٹر کے ناطے وہ اپنے کرداروں کی نبض سے بھی بخوبی آشنا ہیں۔اُن کی شعری اور نثری تخلیقات میں زندگی کے صحت مند عناصر پوری قوت کے ساتھ ابھرتے ہیں اور پڑھنے والوں کو متاثر کرتے ہیں۔ ڈاکٹر آثاری ایک باشعور قلم کار ہیں اور ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے اُن کی ایک بڑی خصوصیت یہ بھی ہے کہ زندگی کے چھوٹے بڑے اور دلچسپ واقعات کو افسانوی روپ دے کر اپنی تخلیقی اظہار کا وسیلہ بناتے ہیں۔ مجھے یہ کہتے ہوئے مسرت ہو رہی ہے کہ ڈاکٹر اشرف آثاری ریاست کے موجودہ دور کے حساس اور باحوصلہ افسانہ نگار ہیں۔اُن کے افسانوں میں ایک جانب کشمیر کی خوبصورتی نظر آتی ہے تو دوسری جانب کشمیر کے موجودہ پرآشوب دور کے حالات وواقعات کی صاف گوئی سے عکاسی بھی کرتے ہیں۔اُن کے تجربات اور مشاہدات وسیع ہیں اور وہ تخلیقی و تحقیقی فکر کے چراغوں سے روشن ہیں۔ وہ موضوع کا انتخاب

کرتے وقت اسلوب کا خاص خیال رکھتے ہیں۔ الفاظ کے مناسب استعمال کو ترجیح دیتے ہیں۔ اُن کو سماجی زندگی کا گہرا مطالعہ ہے۔ وہ صداقتوں کے ایسے تیر چلاتے ہیں کہ ہماری آنکوں میں آنسو ٹھہر نہیں پاتے ہیں۔ مجھے اس بات کا فخر ہے کہ ڈاکٹر صاحب جیسی قد آور ادبی شخصیت میرے رفیق بھی ہیں اور دوست بھی۔



Vehshi Syed: Story teller with a twist

Haroon Mirani

The Article carried from "Greater Kashmir" Vol. 30; No. 255 dated September 16, 2017

In 1967 when Vehshi Syed was trying his hand at writing he started submitting his short stories to various Urdu magazines. Almost every magazine sent him a rejection slip in reply, and his excitement of getting published diminished with every passing day. During interaction with other budding writers he came to know that he was not alone in the boat and many others, and often brilliant writers met the same fate whenever they tried to publish their stories, poems or novels in the few magazines that were present at that time. It was at this time that he decided to start his own urdu Magazine *"Nagina"*. The magazine proved to be a hit among readers and writers alike at that time as it tried to fill a gap for new writers.

At his Karan Nagar office, young Vehshi Syed whose real name is Mohammad Syed Trumboo, used to be surrounded by a group of 20-30 youngster majority of whom were aspiring writers. Discussion and debates would follow and the writers used to get space in the *Nagina*. The Urdu magazine did wonders with literary circles of Kashmir, and has the distinction of giving space to renowned writers like Rafiq Raaaz, Umar Majeed, Shamusuddin Shameem and many more. "It was not only local writes but I would get submission from all over India and many renowned contemporary writers used to get published in Nagina," said Syed who used to pool money from his own

pocket and from his brother's, "My mother was also a big supporter of the endeavour."
The magazine got registration in 1968 and continued its journey for next ten years on regular basis. "Once I went to Allahabad railway station and was amazed to see that a famous chain of book stores had ordered 1200 copies of my magazine. Nagina used to go places and people used to eagerly wait for it." said Syed who besides a writer is an astute businessman.
As Nagina progressed, so did his own writing skills. In 1971 Syed published his first book, *Sadak Jaa Rahi Hai*, a collection of short stories. It was received well and people praised the youngster for the bold attempt. Syed always wanted to do something different and he experimented with various styles in his writing. Even as short stories present a limited scope to innovate but Vehshi did introduce many new things in it.
His love for writing emanates from his childhood experience when various artisans would visit his business family and often interact with Syed and narrate to him fairy tales and stories of kings. "I often would listen in awe and think when will I be able to tell such Padshah Daleels (fairy tales). "As I grew up I was fascinated by detective novels and would voraciously read them." says Syed, 71.
The combination of old folklore with excitement and speed of detective novels helped him create a new aura in his stories. His novels are such that when a reader thinks the particular happening is an end, the plot changes unexpectedly. Similarly the central character keeps on changing until the main character emerges. All this keeps readers on their toes.
His second book was *Pathar Pathar Aaina*, published by Nayi Duniya Publications, New Delhi in 1973. The book was collection of two novels and was received well in literary circles. His third book Kunware Alfaz Ka Jazeera, which was again a

collection of short stories.

After his third book, Syed took a long leave from organised writing. "Other works took my priorities on primarily I got busy in my jewellery business. I visited various countries but there was something which I always missed," said Syed.
It was only at the beginning of this decade that Syed started to come back to literature primarily because his son took over the business leaving him free to spend more time with books. As they say a craftsman never forgets his skill, similarly Syed too never forgot his writing skill and in fact his world experience over the years only increased his vision and depth of writing.
In 2015 Syed's novel *Mazi aur Haal* was released by renowned poet Prof. Hamidi Kashmiri. Prof. Hamidi while praising the technique used by author in his work said, "normally there is a beginning, middle and an end in a novel. But Vehshi has taken the technique of novel writing to a whole new level. He propagated a new style of writing bereft of traditional rules. He turned it into a beautiful abstract art." Terming Vehshi's writing style as an epitome of creativity, Hamidi said that the author has a keen eye on the events of life. "Kashmir has been going through many phases of oppression, bloodshed and suffering. And these phases too find their way into Vehshi's work. He has highlighted every type of tragedy befalling on kashmiris in his work," said Hamidi. "I remember he was a brilliant student of mine and would talk when others remained silent. Then he went silent for sometimes and one day emerged with a plethora of beautiful work."
Recently Syed wrote a collection of short stories that also included an analysis at the end. It was an experiment never tried before. The readers loved it. Few months back Prof. Afzaal Hussain, who has also served VC to AMU also published select stories of Mantoo along with analysis at the end. Afzaal who

had visited Kashmir to meet Syed, attributed the introduction of such a style in short story writing to Syed.
In almost all of his earlier stories and novels, human values used to be the pivotal subject but off late he has taken up other subjects too. Be it floods or a human shield used by army. Syed has written on every subject. During his liberation period, Syed used to write down various stories and novels, and it was only after 2010 that he started collecting them and publishing.
His fourth book *Khwaab Haqeeat* was actually collection of short stories which he had written between 2007 and 2012. Though he is not well known among public primarily due to his long absence, but off late he is getting his due recognition. Recently he held an interactive session with almost 400 students at Distant Education Department of Kashmir University.
His unique style has invited research into his mode of writing too. Two M Phil degrees, one at Jammu University and another at Hyderabad University, have been completed on his persona and writing. Two Ph.D degrees on Vehshi Syed are also been pursued by two students at Barkatullah University and Jaipur University respectively.
The recognition also came with awards that were bestowed on him in the state and outside. He recieved Urdu Foundation Award in Maharashtra in 2012. Mohsin Urdu Award from Banaras in 2013, Intellectual Peace Award from UP in 2013, Nawab Syed Ali Wala Jaa Award from Chennai in 2014 and several awards in Kashmir.
Vehshi who also wrote short stories for Daily Aftab for almost five years, had been in news ever since he was a rookie writer. Back in 1970 famed writer Ab. Qadir Sarwari wrote almost three pages on Vehsis Syed terming him as one of the important short story tellers of future. In the same year an article titled *Intikhab* in Tameer showered praise on his writing skills. Till

date almost 150 writers have written on Vehshi Syed.

His latest book Asman Meri Muthi Main has preface by three literary gaints Sham-u-Rahman Farooqi, Hamidi Kashmiri and Dr. Shama Afroz Zaidi. Currently he is working on his new book *Aristu ki Wapsi*.

Syed has the privilege of having his work translated in other languages too. His stories have been published in Hindi, Kannada and Gujarati. Some of the stories have made their way to theatre too in Maharashtra.

Veteran critic Noorul Hussain once wrote about Syed that he has the distinction of giving new direction to short stories in Urdu.

On a personal note Syed still likes the excitement of detective novels. His all time favourite writer has been *Ibn Saifi*, veteran detective stories writer. "His command over the language and the plot has always amazed me," says Syed.

The student of legendary , G.N. Firaq was favourite with students too. Hamidi Kashmiri during his teaching days often used to tell his students to be like Vehshi Syed. It is said that had Vehshi not taken leave from the literature, he would have been at the pinnacle of writing.

Whenever Syed gets an idea for a story, he tries to write it down and then it takes days and often weeks to refine it. As Syed is ready for the release of his new collection of short stories *Aristu Ki Wapsi*, readers are set to experience another roller coaster ride of excitement which has become USP of Syed's stories.



فلک رنگ تاثرات

(وحشی سعید کی شخصیت اور فن سے متعلق)

''مجھے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ وحشی سعید کے افسانے زبان وبیان کے تخلیقی سرچشموں کو جگانے اور حیرت ونشاط سے ہمکنار کرنے کی مقناطیسی کشش رکھتے ہیں۔ یہ چھوٹے موٹے افسانے ہیں جو تخلیقیت کے اسرار ورموز سے قاری کو حقیقت سے الگ کرکے فن کی طلسمی دنیا میں لے جاتے ہیں''

۔۔ پروفیسر حامدی کاشمیری

''فکشن کے مشہور نقاد دوروفت کے مطابق افسانہ یا ناول میں تین جہات کا ہونا ضروری ہے

۱۔ جنسیاتی جہت "Semantic" یعنی

۲۔ نحویاتی جہت "Syntactual" کہانی کے مختلف اجزا میں ترتیب کی جہت

۳۔ لفظیاتی جہت "Verbal" یعنی لفظوں اور ترکیبوں کے مصنوعی استعمال کی جہت

وحشی سعید کے افسانوں میں یہ تینوں جہات یکجا ہوکر ان کے افسانوں کو فنی اور جمالیاتی، لسانی وموضوعاتی ہر اعتبار سے اہم بناتے ہیں''

۔۔ پروفیسر قدوس جاوید

''وحشی سعید افسانے تراشنے کا فن جانتے ہیں بلکہ اردو زبان پر بھی عبور رکھتے ہیں۔ ان کے مکالمے نہ صرف جان دار بلکہ پڑھنے والے کے ذہن میں اُتر جانے والے ہیں۔ ان کے

فقروں اور ترتیب میں منفرد انداز پایا جاتا ہے جو ان کی فنی ریاضت کی دلیل ہے''

۔ ۔ رشید امجد (پاکستان)

وحشی سعید نے اپنے افسانوں میں ایک ایسے اسلوب کے زیرِ اثر اپنی پہچان بنائی ہے جو قاری کو تخیل کے ساتھ پوری طرح جوڑے رکھنے میں کامیاب ہے۔

حسیب سوز ۔ ۔ مدیر ''لمحے لمحے''

وحشی سعید کے افسانے علامتی انداز میں عہد حاضر کے حالات و حادثات و موضوعات سے متاثر ہیں۔ اُن کے افسانے علامتی انداز کے ہیں۔ علامتی انداز سے تعلق رکھنے کے باوجود ہمیں بہت متاثر کرتے ہیں۔ سچی بات اگر کہی جائے تو ان کے افسانوں میں مستقبل کے روشن امکانات نظر آتے ہیں۔

شان بھارتی ۔ ۔ مدیر رنگ

معیاری علامتی افسانوں میں عصر حاضر کے مسائل کو ترجیح ملی۔ جن معاملات و مسائل کے ساتھ ایک فرد نبرد آزما تھا ان کا بھرپور اظہار علامتی پیرائے میں ہوا اور موثر طریقے سے ہوا۔ وحشی سعید نے اب تک جتنے افسانے تخلیق کئے ہیں اُن میں کثیر تعداد علامتی افسانوں کی ہے اور آج بھی وہ اس طرز کے افسانے تخلیق کرنے میں جٹے ہوئے ہیں لیکن ان کے افسانوں کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ یہ افسانے مبہم نہیں۔ ان میں باقاعدہ علامتی افسانوں کے لوازمات کا بھرپور خیال رکھا گیا ہے۔

۔ ۔ ڈاکٹر اشرف آثاری

وحشی سعید اردو افسانوی ادب پر اس طرح اُبھرے اور اس طرح روشن ہوئے کہ جموں کشمیر کا افسانوی ادبی منظر مزید تابناک نظر آنے لگا۔ یہ بات اس لئے بھی منفرد مقام رکھتی ہے کہ جس قسم کی زبان و اسلوب کا استعمال انہوں نے اپنے افسانوں میں کیا ہے وہ خالص فکشن کا اسلوب ہے۔

ڈاکٹر سیفی سرونجی ۔ ۔ مدیر: انتساب

جہاں تک فکر وخیال کا تعلق ہے، وحشی سعید کی نگارشات میں ذہنی ارتقا کی نشاندہی کی جا سکتی ہے۔ وہ وقت کی گردش کے ساتھ زندگی کے سوچ سمندر میں بہت آگے نکل چکے ہیں۔ مجموعی طور پر دیکھا جائے تو وحشی سعید کے یہاں ایک حساس دل اور تخلیقی دماغ ہے۔

۔۔ دیپک بدکی

وحشی سعید کو افسانے کی ٹریٹمنٹ اور زبان پر دسترس حاصل ہے۔ ان کے افسانوں کے عنوانات بھی اپنے اندر افسانوں جیسے معنویت کے حامل ہیں اور معنی خیز ہیں۔

۔۔ سلیم انصاری

وحشی سعید کے افسانوں میں گیرائی اور گہرائی از خود سانس لیتی ہوئی نظر آتی ہے۔ پلاٹ، کردار نگاری اور داخلیت، موضوع کی صداقت اور اہمیت، یہ سب کچھ ان کے افسانوں کو سمجھنے میں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔

۔۔ کرشن کمار طور

وحشی سعید نے وحشت وجنون کی عظمت ورفعت کو بڑی گیرائی اور گہرائی سے سمجھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہیں اپنے نام سعید اور تخلص وحشی پر بجا طور پر فخر ہے۔

۔۔ رئیس الدین رئیس

وحشی سعید کے افسانوں کے چھوٹے چھوٹے مکالمے اپنے اندر ماضی، حال اور مستقبل کے حوالے سے ایک جہانِ معنی رکھتے ہیں۔

۔۔ جاوید انور

وحشی سعید خیال اور کسی قابل ذکر حادثے، کسی تاریخی منظر، کسی غیر معمولی نوعیت کے واقعے کو اپنی حساس لہروں میں رکھ کر افسانے کے روپ میں ڈھالتے ہیں تو اس کے بیانیہ کے رگ رگ میں تجسس کے لہو کو بھی گرما دیتے ہیں جس کی بناء پر افسانے کے قاری کا رشتہ افسانے کے ساتھ مضبوط تر چلا جاتا ہے۔

۔۔ شارق عدیل

وحشی سعید کا خمیر جنت نظیر خطہ کشمیر کی مردم خیز مٹی سے اُٹھا ہے۔ موصوف گورے چٹے، خوش مزاج، خوش اطوار، خوش گفتار، خوش رفتار، روادار، غم گسار، غم خوار، طرح دار، وضع دار، امن وآشتی پرستار، یکجہتی اور انسان دوستی کے طلب گار، نہایت ہی پرکشش اور قابل قدر شخصیت واقع ہوئے ہیں۔ ۔ ۔ ڈاکٹر مجیب شہزر

آپ وحشی سعید کے افسانوں کا مطالعہ کریں تو آپ کے بھی خواب حقیقت میں بدل جائیں گے۔ آپ اُن کی تحریریں پڑھ کر کھل کھل جائیں گے اور انہیں دعائیں دیں گے۔

۔ ۔ نٹ کھٹ عظیم آبادی

جناب وحشی سعید کا مشاہدہ وسیع ہے اور تجربات زندگی نہایت عمیق و دلچسپ ہیں۔ زندگی کے گوناں گوں تجربات و مشاہدات کو فلسفیانہ انداز میں افسانوی رنگ دینے میں انہیں کمال حاصل ہے۔ افسانوی نفسیات سے کماحقہ واقفیت کی غمازی ان کے افسانوں میں جگہ جگہ چھلک پڑتی ہے۔ ۔ ۔ اصغر ویلوری

وحشی سعید کے بعض افسانوں میں روایتوں اور پرانی قدروں کی پاسداری نظر آتی ہے۔

۔ ۔ محمد قسیم اختر

اس جگمگاتی اردو دنیا میں افسانہ نگاروں کی طویل قطار ہے۔ اس طویل قطار میں کبھی نگاہ دوڑتی ہے تو وحشی سعید پر جاکر رُک جاتی ہے۔ طویل قطار میں کھڑے ہوکے دوسرے افسانہ نگاروں سے ممتاز۔ ۔ ۔ احمد عثمانی

جب میں نے وحشی سعید کے افسانوں کا مطالعہ کیا تو میں نے پایا کہ اُن کا سماجیاتی مطالعہ بہت وسیع ہے۔ حالات وواقعات اور سانحات کو جانچنے پرکھنے والی ان کی آنکھوں نے زندگی کے حسین خواب سجائے ہیں تو وہیں انہوں نے سماج اور معاشرے میں پنپ رہی اُن تمام برائیوں اور لعنتوں کو بھی موضوع بنایا ہے جن کے باعث ہمارا پورا معاشرتی نظام مفلوج ہوکے رہ گیا ہے۔ ۔ ۔ ڈاکٹر مشتاق احمد وانی

وحشی سعید کے افسانوں میں جو علامتیں استعمال کی گئی ہیں وہ مبہم نہیں ہیں اور علامتوں کے معنی متعین ہونے کی وجہ سے بآسانی سمجھ میں آجاتی ہیں اور یہی اُن کے تجریدی افسانوں کی کہانی ہے۔ ۔ ۔ ڈاکٹر علی منیر؛ مدیر اُفق ادب

وحشی سعید کا شمار موجودہ دور کے قدآور افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ ان کا مطالعہ نہایت وسیع اور نظر باریک ہے۔ مغربی اور مشرقی ادب پر انہیں دسترس حاصل ہے۔

۔ ۔ عرفان عارف

وحشی سعید بحیثیت ناول نگار اپنے لئے مستقل جگہ بنانے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ناول کے فنی لوازمات اُن کے پیش نظر ہیں اور ان کے یہاں فنی حیثیت دوسرے ناول نگاروں کے مقابلے میں زیادہ ہے۔ ۔ ۔ مظہر امام

وحشی سعید!

کشمیری مزاج، وحشی مگر باہوش، دراز قد، عشق چشم مگر مستقل پن، پُر اعتماد قلم، اپنوں کے بہی خواہ، دشمنوں کے دوست مگر اپنے دشمن، جذباتی مگر ٹھہراؤ ارادے، خوش پوشاک، گلاب رنگ مزاج، ڈل جھیل جیسی رنگت، شاعری سلسلے کے ناول وافسانہ نگار (شہ زور کاشمیری، حامدی کاشمیری، سیماب اکبرآبادی) تخلیقی بیانیہ جو کرشن چندر، کہانیوں میں بیدی کی طرح سنجیدہ، اپنے اسلوب کا احترام کرنے والے، دھنک رنگ سوچ، اوپر سے سیب کی طرح سخت اندر سے نرم، کشمیری زبان کی محافظ، اردو کے عاشق، اردو کی ادبی صحافت کے نگینہ۔

۔ ۔ افتخار امام صدیقی مدیر ''شاعر'' ممبئی

وحشی سعید نے اِدھر اچھے افسانے لکھے ہیں۔ مثلاً ''آسمان میری مٹھی میں'' اور ایک علاقی کہانی ''عجائب گھر کا طوطا'' اور بھی کئی کہانیاں متوقع ہیں۔ بات دراصل یہ ہے کہ وحشی

سعید ایک کثیر الجہات انسان ہیں۔ بیشتر ملکوں کا بار بار سفر کیا ہے اور سال میں دو ایک بار اب بھی جاتے ہیں۔ اس لئے ان کے پاس کہانیوں کی کمی نہیں۔ کہانیاں ان کے پاس ہاتھ جوڑے کھڑی رہتی ہیں۔

ڈاکٹر ظہیر انصاری مدیر "تحریر نو"، ممبئ

وحشی سعید کی فکشن نگاری کی ایک خصوصیت تو یہی ہے کہ وہ جس عہد کی بات کرتے ہیں اور جس شہر، جس گلی، جس مقام کے حالات صفحہ قرطاس پر اُبھارتے ہیں وہ مکالمے اور منظر کشی کے اعتبار سے اتنے مستحکم ہوتے ہیں کہ قاری اسی شہر اور اسی عہد میں پہنچ جاتا ہے۔ ان کے افسانے حیرت و استعجاب میں مبتلا کرتے ہیں۔

۔ ۔ عالم بنارسی

کشمیر کے افسانہ نگاروں پر شخصی طور پر تو لکھا گیا، لیکن جب بھی افسانہ نگاری کے فن کا جائزہ لیتا ہوا کوئی مضمون لکھا گیا، ان کو نظر انداز کیا گیا۔ اس خصوص میں میں بھی گناہ گار ہوں۔ اس کی ایک وجہ تو یہ بھی ہے کہ میرے پاس ان کی کتابیں نہیں ہیں۔ مجموعی تاثر تو کتاب کا مطالعہ ہی پیدا کرتا ہے، لیکن اب میرے پاس ان میں سے چند قلم کاروں کی کتابیں پہنچیں تو ان کے مطالعے نے مجھے ششدر کر دیا۔ ان میں ایک نام وحشی سعید کا بھی ہے جو تواتر کے ساتھ لکھ رہے ہیں۔ اپنے ادبی سفر کو طے کرتے ہوئے انہوں نے افسانے کی تکنیک کا وہ سرا پالیا جو انہیں اپنے معاصرین کے اسلوب سے مختلف کرتا ہے۔ انہوں نے تاریخ، کلاسیکی ادب، روایات اور حکایات کی شمولیت سے عصری جبریت، انتظامیہ کی خود غرضیوں، طریقہ حکومت اور ان سب میں جھلستے ہوئے عام آدمی کے درد کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ وہ اپنے افسانوں کو کلائمکس تک پہنچاتے پہنچاتے اپنی زمین سے بلند ہو کر عالمی پس منظر کی بربریت، مفاد پرستی، اسلحہ کے کاروبار اور صارفیت کے ان گھناونے اثرات کو اُجاگر کرتے ہیں جن سے خاص طور پر عالم اسلام اور تیسری دنیا کے

ممالک جوجھ رہے ہیں۔

وحشی سعید کے افسانے دعوت فکر بھی دیتے ہیں اور احساسات پر ضرب لگاتے ہیں۔ میں اُن کے مطالعے کی دعوت دیتا ہوں۔ ۔ ۔ نوالحسنین

کشمیر میں اردو فکشن کے ارتقا کی تاریخ اس لحاظ سے دلچسپ ہے کہ اس میں وحشی سعید جیسے قلم کار آندھی کی طرح ابھرتے ہیں اور طوفان کی طرح چلے جاتے ہیں۔ وحشی صاحب نہ صرف کہانیاں لکھتے ہیں بلکہ ریاست میں اپنی طرز کا ایک منفرد ماہنامہ ''نگینہ'' بھی آپ سے وابستہ ہے۔ آپنے اس رسالے کے بعض یادگار اور ضخیم نمبر بھی نکالے ہیں۔ اس کے بعد وہ اپنے افسانوں کے خوب صورت مجموعے بھی شائع کراتے رہے۔ وہ اسی پر بس نہیں کرتے۔ ان کی 57 کہانیوں کے مجموعے ''سڑک جارہی ہے'' کے پورے صفحے کے اشتہار برصغیر کے مقبول رسائل میں اس انکشاف کے ساتھ شائع ہوتے ہیں کہ کتاب برائے نام قیمت چھ روپے میں تقسیم کی جارہی ہے جو لگ بھگ ساڑھے چار سو صفحات پر پھیلی اس کتاب کے لئے مروجہ قیمت سے بہت کم قرار دی جاسکتی ہے اور پھر ایک دن وہ اظہار کے اس وسیلے کو منجدھار میں چھوڑ کر اچانک کسی نئے ساحل کی تلاش میں نکل پڑتے ہیں۔ بہر کیف ان ہی تضادات میں کہیں تعبیروں کا عکس بھی جھلکتا ہوگا۔

وحشی سعید کے فن میں بھی یہی تضاد اور بغاوت نظر آتی ہے وہ روایات سے انحراف کر کے اپنی ایک الگ جداگانہ راہ اختیار کئے ہوئے ہیں۔ ان کا موضوع بھی نیا ہے اور تکنیک بھی انوکھی ہے۔ ان کے افسانوں کی وسیع آرٹ گیلری میں جتنے کردار نظر آتے ہیں وہ محض پرچھائیاں نہیں ہیں بلکہ گوشت و پوست کے جیتے جاگتے انسان ہیں۔ ان کو انسان کی سائیکی میں جھانک کر اس کی روح کا ایکس رے لینے کا ڈھنگ آتا ہے۔ ہر افسانہ زندگی کے گہرے مشاہدے اور فطرتِ انسانی کے عمیق مطالعے کی جیتی جاگتی تصویر پیش

کرتا ہے۔ ''سائے کی لاش'' کا بوڑھا مصور ہو'' جب وہ نغمہ چھیڑتی ہے'' کی رینو کا دیوی یا شالنی ہو یا پھر ''سڑک جا رہی ہے'' کی نینا ہو۔ سبھی کردار روزمرہ زندگی کی عریاں تصویریں پیش کرتے ہیں۔ مصنف فرائیڈ کے نظریہ جنس سے بھی متاثر نظر آتے ہیں۔ ان کے بیشتر افسانے اس محور پر گھومتے ہیں۔ یہاں وہ یہ عندیہ دیتے ہیں کہ وحشی طاقتوں اور شیطانی قوتوں کے غلبہ کے باوجود بھی انسان مرا نہیں ہے۔ یہ فلسفیانہ بصیرت ''تہذیب یافتہ لوگ''، ''انداز'' اور ''طوفان'' جیسے افسانوں کے مطالعے سے بھی ظاہر ہوتی ہے۔

وحشی سعید کے افسانوں میں مقامی بوباس عنقا ہے۔ آپ کے افسانے ممبئی کی فلمی دنیا سے لے کر اینگلو انڈین لوگوں کے مسائل کا احاطہ کرتے ہیں۔ ''ہڑتال'' اور ''جب ممبئی جھک جائے گی'' قبیل کے درجنوں افسانے اس مجموعے میں شامل ہیں، لیکن ''طوفان'' کی طرز کے افسانے نہ ہونے کے برابر ہیں۔ کشمیر کی سحر انگیز سرزمین نے کرشن چندر اور عزیز احمد سے لے کر اوپندر ناتھ اشک تک درجنوں چوٹی کے قلم کاروں کو تخلیق کی تحریک دی ہے۔ لیکن وحشی سعید یہاں بھی اپنی ترنگ میں متضاد لہر کے ساتھ چلے جاتے ہیں اور مقامیت کے رجحانات سے اجتناب کرتے ہیں۔ آپ کے فن میں جس چیز کو بلا تامل سراہا جاسکتا ہے وہ زبان و بیاں پر آپ کی اچھی خاصی قدرت ہے۔ اس قدر سلاست اور عبارت کی روانی آپ کے کئی ہم عصر دوستوں میں برسوں کی مسلسل ریاضت کے باوجود بھی نہیں آسکی ہے۔

جان محمد آزاد ۔ ۔ ''جموں وکشمیر کے اردو مصنفین'' (2004)

وحشی سعید کو خداوند کریم نے پرواز قلم کی قوت سے نوازا ہے جو کسی عطیہ یا انعام سے کم نہیں۔ خوشی اس بات کی ہے کہ مصنف نے اپنی کہانیوں میں اصلاحی اور مقصدی پہلو کے ساتھ افسانوی پہلو کا بھی التزام رکھا ہے۔ واقعات کی بہترین ترتیب، کرداروں کی

اُٹھان اور مکالموں کی برجستگی ایسی خوبیاں ہیں جو ان کے افسانوں کو اعتبار بخشتی ہیں۔ ان کے درجنوں افسانوں میں شاید کوئی ہی ایسا افسانہ ہو جسے منفرد انداز نگارش کی کرشمہ سازی کہا جا سکے۔ ان کے بعض افسانوں میں جرأت اظہار اور بے باکی اس حد تک ہے کہ کہیں کہیں عریانی حاوی ہو جاتی ہے۔ یہ عریانی عصری شعور کی دین ہو سکتی ہے۔ عصری آگہی وحشی سعید کے بیدار شعور کا ایک اہم جز جو افسانوں کو ایک نئی سمت عطا کرتا ہے۔

ڈاکٹر شمع افروز زیدی ۔۔ مدیرہ ''بیسویں صدی'' (دہلی)

نفاست اور سادگی انسانی فطرت کا ایک حصہ ہے۔ وحشی سعید کی اس خوبی نے مجھے متاثر کیا کہ انہوں نے ایسے کرداروں کو بطور انسان پیش کیا ہے اور وہ انسان کو انسان رہنے کی ترغیب دیتے ہیں۔ انسان کو انسانی زندگی گزارنے کا حوصلہ دیتے ہیں۔ وحشی سعید کا کمال یہ ہے کہ وہ اپنے کرداروں کے ذریعے انسان کو اس کی فطری زندگی کا احساس بڑے ہی پر کشش انداز میں دلاتے ہیں۔

۔۔ ڈاکٹر محمد امتیاز احمد

وحشی سعید اردو افسانوی ادب پر اس طرح اُبھرے اور اس طرح روشن ہوئے کہ جموں کشمیر کا افسانوی منظر نامہ مزید تابناک نظر آنے لگا ہے۔ یہ تابناکی اس لئے اپنا منفرد مقام رکھتی ہے کہ جس قسم کی زبان کا استعمال انہوں نے اپنے افسانوں کی تحریر کے لئے استعمال کیا ہے وہ خالص فکشن کا اسلوب ہے اور مختصر افسانوں کے لئے بہت موزوں ہے۔

۔۔ عثمان جوہری

وحشی سعید کے افسانوں کے موضوعات کی وسعت بین الاقوامی مسائل تک پھیلی ہوئی ہے۔

۔۔ ڈاکٹر بختیار نواز

وحشی سعید کے ناولٹوں کا موضوع تہذیب یافتہ ہے۔ مواد یت اور اسلوب کے لحاظ سے معاشرے کی تہذیبِ گزشتہ کی عکاس کہانیاں اور کرداروں کے داخلی کرب کے حوالے سے انسانی فطرت کی بھرپور نمائندگی کی گئی ہے۔

۔ ۔ ڈاکٹر آصف سعید

وحشی سعید کی علامتی کہانیاں جہاں ایک سنجیدہ قاری کے دماغ کے کئی کئی در کھول کر داد و تحسین وصول کرتی ہیں وہیں سیدھے سادھے قاری کو ایک لمحہ بھی برداشت نہیں کرتیں اور کہانی سے باہر کا راستہ دکھاتی ہیں۔

۔ ۔ ڈاکٹر ظفر سرونجی

وحشی سعید نے اپنے ناولٹ ''فطرت'' میں علامات کے ہمارے قاری کے ذہن کو ابتداء میں ہی جھنجھوڑنے کی بھرپور کوشش کی ہے تا کہ پیش آنے والے واقعات کے لئے اپنے ذہن اور دل کو تیار کرے۔ زبان و بیان کی چاشنی، تہذیب و ثقافت پر مصنف کی گہری نظر اور پختہ شعور نے اس ناولٹ کی اثر اندازی میں چار چاند لگا دیئے ہیں۔

۔ ۔ ڈاکٹر مشتاق حیدر

وحشی سعید کی کہانیاں پڑھ کر آپ ایک نئے ذائقے اور ایک نئے جہاں سے روشناس ہوں گے کیونکہ اُن کا اسلوب جداگانہ ہے اور منظر نامہ بھی، جو کہانی کا اعلیٰ ذوق رکھنے والوں کی فکر و سوچ کو سیراب کرنے کی پوری صلاحیت رکھتا ہے۔ یکسانیت کے غبار میں ان کی یہ کہانیاں ہمیں نئے موسموں کا پتہ دیتی ہیں۔

۔ ۔ محمود ملک

وحشی سعید کی علمی شخصیت سعادت مندی کی علامت ہے۔ اُن کا چہرہ بشرہ بہت ہی خوش نما ہے اور ان کی نگارشات سے ان کی متانت اور سنجیدگی کا ثبوت ملتا ہے۔

۔ ۔ مرزا بشیر احمد شاکر

میں پورے وثوق سے کہہ رہا ہوں کہ وحشی سعید سماج کی دکھتی رگ پر قلم کا نشتر چلا کر آئینہ دکھا رہے ہیں۔ اُمید ہے کہ وہ اسی طرح اپنے قلم کی جولانیاں دکھاتے رہیں گے۔

۔۔ ڈاکٹر زکی طارق

وحشی سعید کے افسانوں اور ناولوں کے مطالعے نے اُن کے فن کارانہ جمال اور کمال کی فنکارانہ کشش واثر انگیزی نے اُن کا مرید ومداح بنالیا ہے۔

۔۔ رفیق شاہین

اردو زبان وادب سے وحشی سعید کی والہانہ محبت اور اس محبت میں جنوں کی حد تک آگے نکل جانا نہ کہیں دیکھا ہے اور نہ سنا ہے۔

۔۔ بلراج بخشی

وحشی سعید نے نئے ادبی منظر کو جس طرح اپنی کہانیوں میں روشن کیا ہے اُس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔

۔۔ فیاض رفعت

وحشی سعید کو فکشن سے بہت محبت ہے اور قدرت نے انہیں فکشن کا خالق بنادیا ہے۔

نثار راہی ۔۔ ایڈوکیٹ

اس افراتفری کے دور میں جب کہ روحانی، اخلاقی اور علمی اقدار کے ساتھ ساتھ ادبی اقدار پر بھی جمود چھایا ہوا ہے آپ کی تخلیقات نعمت غیر مترکبہ سے کم نہیں۔

۔۔ حسن ساہو

وحشی سعید کے لب ولہجے کی تازگی اور طرز ادا کی انفرادیت ایسے اوصاف ہیں جن سے ان کی افسانوی نثر خود بخود جگمگا اُٹھی ہے۔

۔۔ شیخ بشیر احمد

جموں وکشمیر میں اردو افسانے کا مستقبل بڑا تابناک دکھائی دیتا ہے کیونکہ اس صنف میں کہنہ مشق افسانہ نگارروں کے ساتھ ساتھ نوجوان افسانہ نگاروں کی پود آگے بڑھتی ہوئی دکھائی دیتی ہے اُنہوں نے ملک کشمیر میں اپنے زور قلم سے قارئین کی توجہ اپنی طرف مبذول کرائی اور یہ ریاست میں اردو افسانہ نگاری کے ایک خوش آئند مستقبل کی علامت ہیں۔ان افسانہ نگاروں میں وحشی سعید کا نام بھی شامل ہے

۔۔ پروفیسر اسداللہ وانی

دوستی میں خلوص اور سچی محبت شامل نہ ہو تو وہ کس کام کی ہے، اور اس کی زندہ مثال ہمارے سامنے وحشی سعید صاحب کی صورت میں موجود ہے۔ نہایت ہی تن دہی اور خلوص کے ساتھ اردو کی ترویج واشاعت کے لئے کس طرح کام کرنا چاہیے، کوئی ان سے سیکھے۔

۔۔ وجیہہ احمد اندرابی

وحشی سعید اپنے اکثر افسانوں کا اختتام کچھ ایسے چونکا دینے والے انداز میں کرتے ہیں کہ قاری نہ صرف چونک اُٹھتا ہے بلکہ کچھ سوچنے پر بھی مجبور ہوتا ہے۔

۔۔ ایم مبین

وحشی سعید ریاست جموں وکشمیر کے قلم کاروں کے اُس قبیل سے تعلق رکھتے ہیں جن کے ادبی کارناموں پر تحقیقی اور تنقیدی نظر سے بڑی گیرائی کے ساتھ جائیزہ لیا جارہا ہے۔

۔۔ ڈاکٹر حبیب نثار

وحشی سعید کی کہانیاں اپنے موضوع، تکنیک اور اسلوب کا ایک نیا ذائقہ پیش کرتی ہیں۔

۔۔ ڈاکٹر محمد صادق

وحشی سعید کے افسانوں کے موضوعات خود ان کی ذات میں پوشیدہ ہیں جس میں انسانی مسائل اور معاشی ومعاشرتی ناہمواریوں اور دیگر مشکلات ومعاملات کا گہرا شعور واحساس موجود ہے جو انہیں افسانے کی تخلیق پر اُکساتا ہے۔

۔۔ رشید راہگیر لداخی

وحشی سعید ایک افسانہ نگار ہیں اور ناول نگار بھی۔ صحافت سے بھی دلچسپی ہے۔ چنانچہ دو تین سال سے ماہنامہ ''نگینہ'' نکال رہے ہیں۔ وحشی سرینگر کے ایک متمول خاندان ترمبو سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے والد تجارت کرتے ہیں۔ وحشی کا اصلی نام محمد سعید ہے۔ اس وقت کشمیر یونیورسٹی میں شعبہ اردو میں ایم اے کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ وحشی کے افسانوں کا ایک مجموعہ ''غریبوں کا دیس'' شائع ہو چکا ہے۔ تین ناول ''خون اور محبت''، ''منزل اور تلاش'' اور ''قحط'' بھی شائع ہو چکے ہیں۔ افسانوں کے مجموعے کو شائع کرتے ہوئے وحشی کو بھی اپنے تازہ وارد ہونے کا احساس تھا، لیکن انہوں نے محض یہ لکھنے پر اکتفا کیا ہے کہ ''اگرچہ ادب کے میدان میں حال ہی میں اُترا ہوں اور اس کے پیچ و خم سے ناآشنا ہوں ۔۔ لیکن اس کم عمری میں جو نظر نے دیکھا ہے آپ کے سامنے رکھنا فرض سمجھا''۔ اس فرض کو نبھانے کی کوشش وحشی نے بساط بھر کی ہے۔ وہ نئے عہد کے رجحانات سے بخوبی واقف ہیں اور نئی تکنیک پر اپنے کارناموں کو ڈھالنے کی کوششوں میں لگے ہوئے ہیں۔

پروفیسر عبدالقادر سروری ۔۔ ''کشمیر میں اردو'' ریاستی کلچرل اکادمی (1984)

جیسے ادبی کام وحشی سعید کرتے ہیں ویسے کام کرنے کے لئے وحشی ہونا ضروری ہے۔ وحشی جنون چاہیے کارنامے انجام دینے کے لئے۔

۔۔ پروفیسر شفیقہ پروین

آیئے ہم سب مل کر دعا کریں کہ وحشی سعید کی وحشتوں کا سایہ اس شہر کی ادبی محفلوں پر ہمیشہ بنا رہے۔ جب دل اور دولت کا سنگم ہو، تب ہی تاج محل بنتا ہے۔

۔۔ جسٹس (ر) بشیر احمد کرمانی



وحشی سعید کے افسانے

وحشی سعید کے افسانوں میں جو چیز سب سے پہلے متوجہ کرتی ہے وہ ان کا تنوع ہے۔ موضوع یا پلاٹ کے لحاظ سے بھی اور تکنیک کے لحاظ سے بھی ان افسانوں میں یک رنگی نہیں ہے۔ یہ بات وحشی سعید کو آج کے افسانہ نگاروں میں ممتاز کرتی ہے۔ یہاں کچھ افسانے براہ راست، سادہ اور کم و بیش روایتی بیانیہ کی مثال پیش کرتے ہیں تو کئی افسانوں میں تمثیل یعنی Allegory کا انداز اختیار کیا گیا ہے۔ تمثیل سے میری مراد یہ ہے کہ ان افسانوں میں جو بنیادی بات کہی گئی ہے اس کے لئے کسی اور بات کا پیرایہ اختیار کیا گیا ہے: بادشاہ، فوجی افسر، صوفی فقیر، ناگ دیوتا، راون، دریودھن، فرعون، موسیٰ، اس طرح کے فرضی یا حقیقی کرداروں کے ذریعے بات کو ذرا پردے میں رکھ کر بیان کیا گیا ہے، لیکن یہ پردے اتنے بھاری نہیں ہیں کہ قاری انھیں اٹھا نہ سکے، یا کم از کم ان کے پیچھے جھانک نہ سکے۔ کچھ افسانے علامتی اور تجریدی انداز کے ہیں۔ یہاں بات کو ذرا اور پیچیدہ کر کے کہا گیا ہے لیکن افسانہ نگار کے مافی الضمیر تک پہنچنے میں کوئی مشکل نہیں ہوتی۔ ''انتظار... اور... میں؟'' یا ''قاتل... مقتول؟'' جیسے افسانوں کو پڑھ کر کسی تنگی یا غیر ضروری الجھن کا احساس نہیں ہوتا، بلکہ ایک طرح کی فرحت ہی ہوتی ہے کہ تجرید اور افسانہ ایک دوسرے سے کچھ بہت الگ بھی نہیں ہیں۔

اس تنوع کے باوجود ان افسانوں میں ایک معنوی وحدت بھی ہے۔ جو احساس، یا تجربہ ان افسانوں کی سطح سے ذرا نیچے لیکن واضح طور پر رواں نظر آتا ہے وہ جبر اور استبداد اور انسانوں کے ایک طبقے کا دوسرے طبقوں پر ظلم اور ان کا استحصال ہے۔ ناجائز قبضہ، اقتدار کی بھوک، اور کبھی کبھی خود انسان کا ظلوم اور جہول ہونا اور جان بوجھ کر نیکی اور انصاف کی جگہ باطل اور کور ضمیری کو اختیار کرنا، زندگی کے یہ تجربے وحشی سعید کے افسانوں کو ہمارے زمانے کے المیے کی تصویر بنا دیتے ہیں۔

وحشی سعید کے یہ افسانے ہمیں زندگی کے بارے میں زیادہ حساس بناتے ہیں اور بظاہر روزمرہ کی زندگی سے دور ہونے کے باوجود ہمیں انسان کی موجودہ صورت حال میں شریک کرتے ہیں۔ کہیں کہیں تو یہ افسانے اس قدر اثر انگیز ہیں اور افسانہ نگار کے درد کا اتنا پرقوت اظہار کرتے ہیں کہ بچپن کی سنی ہوئی کہانیاں یاد آجاتی ہیں۔ جس طرح ان کہانیوں کے کردار اور واقعات ہمارے لئے بالکل حقیقی اور قریبی تھے، کچھ اسی طرح یہ افسانے بھی ہمیں حقیقی اور قریبی معلوم ہوتے ہیں۔

شمس الرحمٰن فاروقی

الہ آباد، اگست ۲۰۱۶ء

MEEZAN PUBLISHERS & DISTRIBUTORS
Opp. Fire & Emergency Services HQRS Batamaloo
Srinagar-190009 Kashmir
Ph.2470851 \ Fax 0194-2457215 \ Cell: 9419002212 / 8494002212
Email: meezanpublishers@gmail.com \ @rediffmail.com
7006733403